اگست ۲۰۱۷ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۱، شمارہ ۸، اگست ۲۰۱۷ء/ ذی القعدہ ۱۴۳۸ھ

مشمولات

O فکر و نظر

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد — مدیر — ۴

O تعلیم و تربیت

- شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے — پروفیسر ملک محمد حسین — ۱۰
- تربیت اساتذہ کا خاتمہ... ذمہ دار کون؟ — پروفیسر ملک محمد حسین — ۱۴

O تعلیم و تحقیق

- ایک دینی جامعہ کی تنظیمِ نو کا خاکہ — ڈاکٹر محمد امین — ۱۵
- مطالعۂ مغربی فکر و تہذیب - کتابیات و مآخذ — سید خالد جامعی — ۲۰

O تزکیۂ نفس

تزکیۂ نفس اور عصر حاضر — ڈاکٹر محمد امین — ۲۹

O اسلام اور پاکستان

- یہ ہمارا ظالمانہ نظامِ عدل! — 'نقیب سحر' — ۴۵
- گندے اور نجس پانی کا استعمال — مدیر — ۴۹

O استفسارات

کون سے علماء انبیاء کے وارث ہیں؟ فرقہ واریت کا سد باب کیسے ہوسکتا ہے؟ دین فروشی سے کیا مراد ہے؟ — ڈاکٹر محمد امین — ۵۰

فکرونظر

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد

ریمنڈ ڈیوس کی کتاب۔امریکی غلامی کی شرعی حیثیت۔اصلاحِ نظامِ تعلیم وتربیت پرامن دینی جدوجہد کی ناکامی۔نئی دینی تحریک ناگزیر ہے

ریمنڈ ڈیوس کی کتاب

ریمنڈ ڈیوس کی کتاب' The Contractor' حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے جس میں اس نے اس امر کا اثبات کیا ہے کہ پاکستان کی عسکری اور سیاسی قیادت نے مل کر اسے آزاد کرایا۔

ہمارے نزدیک یہ کوئی انکشاف نہیں ہے۔البرہان کی فائلیں گواہ ہیں کہ ہم یہی بات ذرا طریقے سلیقے سے، پہلے دن سے کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت امریکی دباؤ میں آکر فیصلے کرتی ہے اور یہی پاکستان کے پڑھے لکھے عوام اور علماء کرام کی اکثریتی رائے ہے۔

امریکی غلامی کی شرعی حیثیت

ہم جیسے لوگ، جو شرعی تناظر میں رہ کر سوچتے ہیں، ان کے سامنے ایک مسئلہ یہ آتا ہے کہ ہماری سیاسی اور عسکری قیادت کی اس روش کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

علماء کرام اور دینی عناصر کی ایک بڑی تعداد اس روش کو غلط سمجھتی ہے اور اس کی اصلاح کے لیے پرامن جدوجہد کی حامی ہے۔تاہم یہاں ایک اقلیتی نقطۂ نظر یہ ہے کہ چونکہ پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت ملک میں شریعت نافذ نہ کرنے پر مصر ہے اور اس کی جگہ مغربی تہذیب (جمہوریت، سیکولرزم، لبرلزم، نظام سرمایہ داری وغیرہ) کو عملاً نافذ کر رہی ہے۔ دوسرے کفار (امریکہ و یورپ) کے دباؤ میں آکر اپنے ان (قبائلی) عوام کے خلاف ہتھیار اٹھا رہی ہے جن کا اس کے سوا کوئی قصور نہیں کہ وہ نواحی علاقے میں اپنے ان بھائیوں کا ساتھ دینے کی کوشش کرتے ہیں جو ایک مسلم ملک پر کفار کے حملے کی مزاحمت کر رہے ہیں اور جس کے جہاد ہونے پر ہمارے علماء کی بہت بڑی اکثریت متفق ہے۔

ظاہر ہے کہ اِن لوگوں کی مذکورہ دونوں باتوں میں وزن ہے لیکن اس کے باوجود ہم تین

اسباب کی بنیاد پر ان کی حمایت نہیں کرتے۔

ایک: اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے ہماری سوسائٹی میں فرد، معاشرے اور ریاست تینوں سطحوں پر پُرامن طریقے سے اصلاح کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی جس کی بنیاد پر کہا جاسکے کہ انہوں نے دعوت و اصلاح کے حوالے سے اتمام حجت کردیا ہے۔

دوم: جس زمانے میں ہم رہ رہے ہیں اس میں ریاست اتنی طاقتور اور اس کا دائرہ کار اتنا وسیع ہے اور مسلم حکمرانوں کو عدم نفاذ شریعت میں یا علمبرداران شریعت کو کچلنے میں کفار (امریکہ ویورپ) کی مدد بھی حاصل ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں آج کی ریاست کو مسلح مزاحمت سے شکست نہیں دی جاسکتی اس لیے اس کے خلاف خروج یا بغاوت صحیح نہیں ہے۔

اور پاکستان جیسی مسلم ریاست کے خلاف لڑکر اسے کمزور کرنے سے جتنا نقصان ہوگا اس کے مقابلے میں جو فائدہ ہوگا وہ اتنا کم ہے کہ اھون البلیتین (یعنی کم تر برائی کو قبول کرلیا جائے) کے فقہی اور شرعی اصول کے مطابق بھی پاکستان جیسی مسلم مملکت کے خلاف ہتھیار اٹھانا غلط ہے۔

سوم: اس خروج کی کامیابی کے لیے اسلام دشمنوں (امریکہ، بھارت، یورپ، اسرائیل) سے مدد لینا اتنا بڑا جرم ہے کہ ہمارے پاس اس کی مذمت کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

ان اسباب کی بنیاد پر ہم ان لوگوں کی حمایت نہیں کرتے جو پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت کی غلطیوں اور غیر شرعی حرکتوں کی وجہ سے ان کے خلاف مسلح جدوجہد کرتے ہیں اور اسے ایک شرعی تقاضا باور کراتے ہیں۔

امریکی غلامی کے اسباب

یہاں دو باتوں پر غور ضروری ہے؟ ایک یہ کہ ہماری سیاسی اور عسکری قیادت کے مغرب (امریکہ ویورپ) کے دباؤ کو قبول کرنے کے اسباب کیا ہیں؟ ہمارے نزدیک اس کے دو بنیادی سبب ہیں۔

۱۔ مغربی فکر و تہذیب سے مرعوبیت

مغربی فکر و تہذیب سے مرعوبیت اور اسے واحد ذریعہ ترقی سمجھنا مغربی تہذیب کی فکری غلامی پر منتج ہوتا ہے جس کے ڈانڈے عملی غلامی سے جا ملتے ہیں۔ پھر مغربی تہذیب کے علمبردار ممالک چونکہ اس وقت دنیا پر غالب اور بالادست ہیں لہٰذا مسلم عسکری و سیاسی قائدین اقتدار میں آنے اور اقتدار میں رہنے یعنی اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور اسے طول دینے کے لیے مغربی طاقتوں کی حمایت حاصل کرتے ہیں اور اس کے لیے ان کی اسلام اور مسلم دشمنی سے بھی صَرفِ نظر کرتے ہیں۔ اس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ حُبّ جاہ اور حرصِ مال کی بڑھتی ہوئی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے مغرب کی غلامی کو قبول کر لیتے ہیں۔

۲۔ ناقص نظامِ تعلیم و تربیت

ہمارے حکمران طبقوں کی یہ ذہنیت کیوں ہے؟ اس کی ایک بڑی وجہ صحیح اور موثر اسلامی تعلیم و تربیت سے ہماری محرومی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارا نظامِ تعلیم اس وقت بھی اپنی روح میں وہی ہے جو فرنگی استعمار نے اپنے مقاصد کے لیے وضع کیا تھا۔ اس کے پیشِ نظر یہ تھا کہ محکومین خصوصاً مسلمانوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے انہیں ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے ایسے قابلِ اعتماد سول ملازم مل جائیں جو اس کے وفادار ہوں اور اس کے نظریے سے سرشار ہوں۔ چنانچہ استعمار نے اور اس کے ہم نوا مسلمانوں (سرسید وغیرہ) نے مسلمانوں کی مذکورہ نقطۂ نظر سے تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ دوسری طرف علماء اسلام نے دیکھا کہ نہ حکومت رہی اور نہ تعلیمی ادارے چلانے کے وسائل تو انہوں نے سوچا کہ وہ کم از کم اتنا تو کر دیں کہ لوگ دین سے بالکل ہی بے بہرہ نہ ہو جائیں اور نماز اور نکاح و طلاق جیسی نبیادی باتوں میں بھی اسلامی احکام سے ناواقف رہ جائیں۔

لیکن ایک موٹی عقل کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد ان دونوں رویوں کو جاری رکھنے کی ضرورت ختم ہو گئی اور مسلم حکمرانوں کو یہ چاہیے تھا کہ وہ نظامِ تعلیم کی وحدت اور اسلامائزیشن کا انتظام کرتے جیسا کہ پہلے بارہ سو سال میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم تھا۔ لیکن جب حکمرانوں نے یہ کام نہ کیا بلکہ جیسا نظامِ تعلیم انگریز نے ورثے میں چھوڑا تھا، اسے ہی بعینہٖ (یا برائے نام کتر بیونت سے) جاری رکھا تو علماء کرام نے بھی سوچا کہ جب حکومت نظامِ تعلیم کو بدلنے پر تیار نہیں تو ہم جو کر رہے تھے، اسے بھی گر ہم نے چھوڑ دیا تو معاشرہ دین سے مزید دور ہو جائے گا

لہٰذا انہوں نے بھی مدارس کا سابقہ نظام جاری رکھا۔

ظاہر ہے ثنویت پر مبنی یہ نظام تعلیم متوازن مسلم شخصیت پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ جدید یا معاصر تعلیم کا نظام مذہبی تعلیم وتربیت سے عاری ہونے کی وجہ سے کالے انگریز پیدا کرتا رہا اور دوسری طرف علماء کرام معاشرے اور ریاست کے لیے افراد تیار کرنے کی بجائے مسجد اور مدرسے کے لیے مولوی، تیار کرتے رہے۔ اس نظام تعلیم کے نتیجے میں جب قدیم وجدید کے جامع، معتدل مزاج، بیک وقت دین دنیا کے حامل افراد تیار ہی نہیں ہو رہے تو معاشرہ کیسے اسلامی اقدار پر عمل کرے گا اور ریاست کیسے اسلامی بن جائے گی؟

نظام تعلیم وتربیت کی اس بنیادی خرابی سے ہم برسوں سے لوگوں کو آگاہ کر رہے ہیں لیکن نہ حکمران ہماری سنتے ہیں اور نہ علماء کرام، تو اس کی اصلاح کیسے ہو؟

پرامن دینی جدوجہد کی ناکامی

اور جب ہمارے پاس پاکستان میں اسلامی جدوجہد کے لیے پرامن کوششوں کے سوا اور کوئی چارہَ کار نہیں اور الحمدللہ، اس کے مواقع بھی موجود ہیں تو پھر ہمیں اس پر سوچ بچار کرنی چاہیے کہ ہماری یہ پرامن جدوجہد کیسے اتنی متوازن اور قوی ہو کہ یہ نتیجہ خیز ثابت ہو۔

اور اس کے ساتھ ہی ہمیں اس بات کا بھی تجزیہ کر لینا چاہیے کہ جو اسلامی جدوجہد پچھلے ستّر سالوں سے پاکستان میں جاری ہے، وہ کیوں اسلام کے حق میں حتمی طور پر نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکی؟

اس بات پر غور کے کئی طریقے ہوسکتے ہیں لیکن مناسب ہوگا کہ ہم اس کا انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں سطحوں کے حوالے سے تجزیہ کریں۔

جہاں تک فرد کی تعمیر واصلاح کا تعلق ہے، ہم سطور بالا میں اپنے ناقص نظام تعلیم کے مفاسد کا ذکر کر چکے ہیں جس کے نتیجے میں دین سے دوری بلکہ بے دینی اور مغرب پرستی پروان چڑھ رہی ہے۔ جہاں تک ہماری دینی اصلاحی جماعتوں (جیسے تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی) کا تعلق ہے تو بدقسمتی سے ان کا تصور دین بھی مذکورہ روایتی دینی تعلیم کے زیر اثر ناقص اور ادھورا ہے۔ وہ اتنے دین کو کافی سمجھتے ہیں کہ لوگوں کا کلمہ صحیح ہو جائے، وہ نماز پڑھنے لگیں، داڑھی رکھ لیں اور شلوار قمیص پہن لیں۔ پورے اسلام کا تصور جو صحیح عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات کا حامل ہو، ان کے ہاں جگہ نہیں بنا پاتا۔ لہٰذا ان کی دین داری کے اثرات معاشرے اور ریاست پر پڑتے ہی نہیں

بلکہ اس محدود دینی تصور کی وجہ سے خود فرد کی بقیہ زندگی پر بھی نہیں پڑتے۔ مسلک کو دین سمجھنے اور عصری تقاضوں سے بے خبری کے عوارض بھی اپنی جگہ موجود ہیں۔

ہمارے ہاں معاشرتی تنظیم کے ذریعے دینی کام کرنے کا تصور بڑا پرانا ہے کہ امت نے صدرِ اوّل ہی سے تعلیم وتزکیہ وقانون (فقہ واصول فقہ اور فتوی واجتہاد) دونوں ریاست کے حوالے نہیں کیے بلکہ اسے معاشرے کی مدد سے پرائیویٹ سیکٹر میں رکھا اور اس سے بہترین نتائج پیدا کر کے دکھائے.... لیکن دینی قوتوں کو کبھی یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ معاشرتی تنظیم کو وسعت دے کر زندگی کے دوسرے بہت سے شعبوں میں بھی مفید اور تعمیری کام کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اس سوچ کے دو بڑے محرک موجود ہیں: ایک یہ کہ ریاست نفاذ دین کی مزاحمت کر رہی ہے اور دوسرے کفارِ مغرب ''سول سوسائٹی'' اور ''این جی اوز'' کے ذریعے مسلم معاشرے کو غیر حکومتی سطح پر مسلم عوام کو دین سے دور کرنے کی موثر کوششیں ہمارے سامنے کر رہے ہیں۔

ریاست کی سطح پر ہمارے ہاں جن دینی سیاسی جماعتوں نے ریاست کی اصلاح کی کوشش کی اور اس سے اسلامی تقاضوں کے مطابق کام لینا چاہا وہ اس میں ناکام ہو گئیں۔ اور مستقبل قریب وبعید میں ان کی کامیابی کے دور دور تک امکانات نظر نہیں آتے۔ یہاں اس امر کا تفصیلی تجزیہ ہمارے پیش نظر نہیں کہ وہ کیوں ناکام ہو گئیں البتہ جس تناظر میں ہم گفتگو کر رہے ہیں اس میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی مسلک پرستی کی بناء پر متحد ہونے کو تیار نہیں۔ دوسرے وہ کامیابی کے لیے صرف سیاسی جدوجہد پر انحصار کرتی ہیں اور فرد ومعاشرے کی اصلاح اور انہیں ساتھ ملانا ان کا ہدف ہی نہیں۔ مغربی فکر وتہذیب اور ان کے علمبردار ممالک کی بالادستی کی وجہ سے مغربی جمہوریت سیکولرزم، لبرلزم، نظام سرمایہ داری سے متاثر ہو جانا اور حبّ جاہ ومال کی وجہ سے اسٹیبلشمنٹ سے متاثر ومغلوب ہو جانا بھی ان کے ہاں عام ہے۔

نئی دینی تحریک کی ضرورت

ان سب حالات کو سامنے رکھنے کے بعد سوال یہ ہے کہ جب موجودہ کوششوں کے باوجود فرد، معاشرہ اور ریاست دین سے دور ہو رہے ہیں اور مغرب کی لادین اور اسلام ومسلم دشمن تہذیب ان پر غالب آ رہی ہے تو اہل پاکستان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام پر عمل اور اس کے غلبے کے لیے کیا کیا جائے؟

ہم پہلے بھی کہتے رہے ہیں اور آج دوبارہ کہتے ہیں کہ بے حسی، مایوسی، پسپائی اور ناکامی کی موجودہ فضا سے نکلنے کے لیے نئی دینی تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔اس مجوزہ تحریک کی چند اہم خصوصیات یہ ہونی چاہئیں۔

ا۔ اس تحریک کی قیادت دو طرح کے لوگ کریں۔ایک ایسے علماء کرام اور دینی عناصر جو مسلک پرستی سے اوپر اٹھ سکیں، جنہیں ’’جدید تقاضوں‘‘ کا احساس ہو، جو جمہوریت اور الیکشن کے ذریعے اسلام نہ آسکنے کا ادراک رکھتے ہوں جو مغربی فکر و تہذب کی ہلاکت خیزی سے آگاہ ہوں اور فرد، معاشرے اور ریاست تینوں سطحوں کی اصلاح کے قائل ہوں۔اس کی قیادت کا دوسرا حصہ ’’سول سوسائٹی‘‘ کے ان ’’پروفیشنلز‘‘ پر مشتمل ہونا چاہیے جو دین دار ہیں اور دینی اصول و اقدار پر عمل کے خواہاں ہیں۔

۲۔ یہ تحریک کسی مخصوص دینی یا سیاسی مسلک کی اساس پر نہ اٹھے بلکہ امت کے مشترکات اور مین اسٹریم اسلام کی بنیاد پر اٹھے۔اور اس میں ہر مسلک اور مشرب کے آدمی اور تنظیمیں شامل ہوں۔

۳۔ اس میں کسی ایک فرد یا جماعت کی بجائے ’اجتماعی قیادت‘ (پریزیڈیم، مجلس تاسیسی، تھنک ٹینک وغیرہ) کو رواج دیا جائے۔

۴۔ یہ بیک وقت تین سطحوں پر کام کرے یعنی فرد، معاشرہ اور ریاست تاکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں میں ایک توازن کے ساتھ دینی میدان میں آگے بڑھا جا سکے۔

۵۔ اس کا ہدف یہ ہو کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام پر یکسوئی سے عمل کیا جائے اور کرایا جائے اور غیر اسلامی افکار و اعمال خصوصاً مغربی فکر و تہذیب، کو رد کر دیا جائے۔

٦۔ اس تحریک کا لائحہ عمل او حکمت عملی کیا ہو؟ اس پر غور و فکر ہم عمداً موخر کر رہے ہیں تاکہ دوسرے لوگ بھی اس موضوع پر سوچیں اور پھر مل کر آگے بڑھا جائے۔

۷۔ دیکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کن افراد اور تنظیموں کو اس عظیم کام کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔

اگر کوئی صاحب علم اس تجویز کے حق میں یا اس کے خلاف لکھنا چاہیں تو البرہان کے صفحات حاضر ہیں۔وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین.

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے

یہ اس گفتگو کا خلاصہ ہے جو تنظیم اساتذہ پاکستان، صوبہ پنجاب کی تعلیمی کانفرنس منعقدمری بتاریخ ۸ جولائی ۲۰۱۷ء میں پیش نہ ہوسکی اور جو ہمارے تین محبت کرنے والے بھائیوں کی حادثاتی موت کی دلخراش یاد چھوڑ گئی۔

۱۔ شکایت اُن سے نہیں جن سے میرا محبت کا تعلق ہے بلکہ اُن تمام اساتذہ کرام سے جن کو میں نہ جانتا ہوں اور نہ پہچانتا ہوں۔ شکایت تو خیر اپنوں سے بھی ہے لیکن بقول شاعر ؎

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے نا گفتہ رہ گئیں

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

وطن عزیز کے حوالے سے اہل کلیسا کے نظامِ تعلیم کی تین بنیادیں ہیں: پہلا انگریزی ذریعہ تعلیم۔ دوسرا مخلوط تعلیم (Co-Education) اور تیسرا کمرشلائزیشن۔ اور ہم ان تینوں بنیادوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ یقین نہ آئے تو تحریکی بھائیوں کی یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکولوں کو حاشیہ خیال میں لائیں، چاروں طبق روشن ہوجائیں گے۔ ہماری ہمت اور دیدہ دلیری کا اندازہ فرمائیں کہ ہم ہر اجلاس اور ہر کانفرنس میں ان تینوں لعنتوں کے خلاف زوردار قرارداد یں ضرور پاس کرتے ہیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا تھا ؎

اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنم نغمہ بے موسم ترا

اب ہم پوری جلالی شان سے تقریریں بھی کرتے ہیں، میڈیا پر تند و تیز بیان بھی داغتے ہیں اور وائیٹ پیپر پہ وائیٹ پیپر بھی چھاپتے ہیں لیکن مخلوط تعلیم سے بہرہ ور بھی ہوتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں آکسفورڈ کی درسی کتابیں بھی لگاتے ہیں اگرچہ ہمارا اپنا دودھ پیتا ’’آفاق‘‘ بھی اب لبرلزم

میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی کتب سے کسی طور پیچھے نہیں۔شاید ایسی ہی صورتِ حال کے لیے علامہ اقبال تقریباً ایک صدی پیشتر کتنی حکیمانہ بات فرما گئے تھے ؎

لیکن نگاہِ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری
رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر

اقبال نے تو یہ بھی کہا تھا اور اس وقت کہا تھا جب انگریز حکمرانوں کا دور اپنے عروج پر تھا کہ ؎

اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا
ہے خونِ فاسد کے لیے تعلیم مثلِ نیشتر

حالانکہ اس وقت کی تعلیم نے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، محمد علی جناحؒ، لیاقت علی خانؒ، علامہ محمد اقبالؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، عبدالرب نشترؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا نعیم صدیقیؒ، چوہدری غلام محمدؒ جیسے گل ہائے سرسبد پیدا کیے۔میں کس کس کا نام لوں، سیکڑوں ستارے ہیں جو آسمان ملت میں چمکتے نظر آتے ہیں۔اور اب میرے اور آپ کے ہاتھوں اور ہمارے فرقہ باز محترم علماء کرام کے ہاتھوں ایک طرف پتلون ٹائی پہنے ممی ڈیڈی کی اولاد پیدا ہو رہی ہے اور دوسری طرف فرقہ پرستی پر مبنی امراضِ ملت پیدا کرنے والے نیم ملا پیدا ہو رہے ہیں۔ان کے درمیان ملت کی جان سلامت ہے نہ ایمان۔ہم دھیان نہیں دیتے بس ٹیوشن کا چکر، امتحانوں کا دھندا اور پرچوں کی جانچ (مارکنگ) ہمیں کب عقل و ہوش سے کام لینے دیتی ہے جب اقبال ہمیں پکار پکار کر کہتا ہے کہ ؎

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تُو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

اب تلک شاید ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ! تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

ملک کے 17 لاکھ اساتذہ میں سے 3500 ارکان تنظیم اساتذہ پاکستان ہیں لیکن اب مسئلہ

یہ ہے کہ میں اور میرے بھائی فکرِ معاش نہیں حرصِ معاش میں مبتلا ہیں۔ اقبال نے شاید ہمارے لیے ہی کہا تھا کہ ۔

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

اور شاید یہی وجہ ہے کہ ۔

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خروش

علامہ اقبال نے اس دور کے مدرسین کے لئے ہی کہا تھا کہ ۔

اہل دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

شیخ مکتب کے طریقوں میں کشادِ دل کہاں؟
کس طرح کبریت سے روشن ہوں بجلی کے چراغ

ہم نے تو ہمارے پاس آنے والے سارے چراغ روشن کرنا تھے لیکن چلیے سارے نہ سہی تنظیم اساتذہ ہمیں سالانہ نصابِ کار میں پانچ چراغوں کو روشن کرنے کا خصوصی ہدف دیتی ہے اور ساتھ ہی چراغ روشن کرنے والے شیوخ مکتب میں دو کے خصوصی اضافے پر کام کرنے کی درخواست کرتی ہے۔ اگر ہم نے اس پر عمل کیا ہوتا تو اب تک کم از کم 5 لاکھ روشن چراغ اور 2 لاکھ کارآمد شیوخِ مکتب تیار ہو چکے ہوتے.... لیکن ہم تو پہلے والے بھی بجھاتے چلے گئے اور جو باقی ہیں وہ بس ٹمٹما رہے ہیں۔ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ 17 لاکھ اساتذہ میں زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین ہزار۔ میری تو حالت یہ ہے کہ ۔

تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جُو کا

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنارِ جُو کا

لیکن پھر سوچتا ہوں کہ ۔

اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوا را تلخ تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کمیابی

اور

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اللہ رب العزت ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

بقیہ: تربیت اساتذہ کا خاتمہ...ذمہ دار کون؟

سرکاری یونیورسٹیوں اور سرکاری ٹیچر ایجوکیشن کے کالجوں میں جب ہمارے اساتذہ نے سکول کلاسز کا مُنہ دیکھے بغیر اور کسی پیشہ ورانہ تدریسی ڈگری سے محرومی کے باوجود پیشہ ورانہ تدریسی کورسز پڑھائے اور تدریسی مہارتوں کے بغیر تدریسی ڈگریاں عطا کروائیں تو پھر رونا کس بات کا کہ سرکاری سکولوں میں حکومت نے اور پرائیویٹ سکولوں میں تعلیمی تاجروں نے تدریس کی پروفیشنل ڈگریوں کو غیر ضروری قرار دیا ہے۔

ہائر ایجوکیشن نے یو ایس ایڈ کی معاونت سے ایسوسی ایٹ ڈگری ان ایجوکیشن کا دو سالہ پروگرام اور بی۔ایڈ کا ڈیڑھ سالہ پروگرام شروع کرنے کا ڈول ڈالا ہے۔اس بوڑھے مدرس کی رائے میں اس سے صرف اتنا فرق پڑے گا کہ طلبا کے تعلیمی مصارف بڑھ جائیں گے اور تعلیمی اداروں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔رہ گیا پیشہ ورانہ مہارت میں اضافہ تو ہمارا وہ مقصد اس دن ختم ہو گیا تھا جب ہم نے ''ٹیچر ٹریننگ'' کے اداروں کو ''ٹیچر ایجوکیشن'' کے ادارے کہنا شروع کر دیا تھا۔جامعہ پنجاب کے ادارہ تعلیم وتحقیق کی انجمن فاضلین سال ہا سال تک ٹیچر ایجوکیشن یونیورسٹی کا مطالبہ کرتی رہی۔آخر یہ ایک نان پروفیشنل پروفیسر کے وائس چانسلر بننے کی حرص کی وجہ سے بن تو گئی لیکن مذکورہ یونیورسٹی ٹیچر ٹریننگ کے علاوہ جہالت کی ڈگریاں بانٹنے کے سارے کام کر رہی ہے۔بس صرف ٹیچر ٹریننگ سے مکمل اجتناب ہے۔بقول کسی شاعر کے ؎

کس نے لوٹا دل ہمارا یہ کہانی پھر سہی
اور دل کے لٹنے کا سبب پوچھو نہ سب کے سامنے
نام آئے گا تمہارا یہ کہانی پھر سہی

تعلیم و تربیت　　　پروفیسر ملک محمد حسین

ایلیمنٹری سکولوں میں
تربیت اساتذہ کا خاتمہ... ذمہ دار کون؟

پہلے صوبہ پنجاب کے تمام ایلیمنٹری سکولز میں تعیناتی سے قبل تربیت اساتذہ کے پروگرام بند کر دیے گئے اور اساتذہ کی تعیناتی میں پیشہ ورانہ تربیت کی اسناد کو غیر ضروری قرار دے دیا گیا اور اب صوبہ خیبر پختون خواہ میں بھی سکول اساتذہ کی بھرتی میں کسی بھی پیشہ ورانہ سند کی شرط ختم کر دی گئی ہے۔ پرائیویٹ سکولز تو پہلے ہی پیشہ ورانہ تدریسی سند کو اہلیت اور کارکردگی کے حوالے سے ایک منفی عامل سمجھتے تھے۔ گویا اب سرکاری تعلیمی اداروں اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں دونوں کے اساتذہ کے لئے پیشہ ورانہ مہارت کے حوالے سے یکساں پالیسی اپنالی ہے۔ چشمِ فلک نے یہ عجیب منظر بھی دیکھا کہ اساتذہ کا غیر تربیت یافتہ ہونا جو پہلے ایک خامی (ڈی میرٹ) شمار ہوتا تھا اب میرٹ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ بجا یہ حقیقت کہ ترقی یافتہ ممالک از قسم امریکہ وغیرہ میں کوئی بھی تدریسی تعیناتی تربیتی ڈپلوما کے بغیر حاصل کرنا ممکن نہیں، چاہے وہ سکول ہو، میڈیکل کالج ہو یا انجینئرنگ کا کوئی ادارہ ہو۔ کہتے ہیں یہ بھی امریکی سازش ہے لیکن یہ سب کچھ اپنے ہی ہاتھوں سے ہو رہا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟

یہ ناروا فیصلے تو بلا شبہ بیوروکریٹ ہی کر رہا ہے لیکن اساتذہ اور تعلیم اساتذہ میں مصروف ہم نام نہاد ماہرینِ تعلیم بھی تو اس جُرم کے ذمہ دار ہیں۔ اوپن یونیورسٹی کے ٹیچر ایجوکیشن کے پروگراموں نے ڈگریوں کے جمعہ بازار کے ساتھ جہالت کا جو اتوار بازار سجایا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ پرائیویٹ یونیورسیٹوں اور سرکاری یونیورسٹیوں سے الحاق کے حامل پرائیویٹ کالجوں نے بغیر کلاسیں لگائے بی۔ ایڈ، ایم۔ ایڈ اور ایم اے ایجوکیشن کے پروگرام صرف فیسیں لے کر اور بغیر کلاسیں لگائے جو ڈگریاں بانٹیں اس کی کہانی ایک علیحدہ دردناک کہانی ہے۔

(بقیہ صفحہ نمبر: ۱۳)

تعلیم و تحقیق　　　ڈاکٹر محمد امین

جدید انداز میں رجالِ کار کی تیاری کے لیے

ایک دینی جامعہ کی تنظیمِ نو کا خاکہ

لاہور کے ایک دینی مدرسہ کے مہتمم صاحب سے ہماری یاداللہ ہے۔ہم نے ایک دن انہیں کہا کہ درس نظامی کی اہمیت بجالیکن ملک میں ہزاروں دینی مدارس درس نظامی پڑھا رہے ہیں لہٰذا معاشرے کو جتنے علماء کرام کی ضرورت ہے ان میں سے اگر آپ کے ایک مدرسے کو نکال بھی دیا جائے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔آپ کوئی اس سے بہتر اور بڑا کام کریں تو کیا زیادہ موزوں نہ ہوگا؟ پوچھنے لگے مثلاً کون سا کام؟ ہم نے کہا ایسے ٹھوس علماء کرام کی تیاری جو دینی علوم میں رسوخ بھی رکھتے ہوں، کردار کے پختہ ہوں اور جدید علوم و معارف اور عصری مسائل اور ضرورتوں سے بھی آگاہ ہوں۔بہت کم مدارس اس طرح کا کام کر رہے ہیں اور اس کی ضرورت بھی ہے۔کہنے لگے وسائل کا مسئلہ ہوگا! ہم نے کہا: اس کا حل یہ ہوسکتا ہے کہ آپ جتنے پیسوں سے دینی مدرسہ میں درس نظامی چلا رہے ہیں وہی پیسے آپ مجوزہ نئے پروگرام پر لگا دیں۔انہوں نے کہا جو لوگ ہماری اعانت کرتے ہیں انہیں بھی اعتماد میں لینا ہوگا لیکن چلیے پہلے آپ پوری اسکیم تو بنا کر دیں۔اگر اس کی تفصیل پر ہم مطمئن ہو گئے تو پھر دوسرے حضرات کو مطمئن کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔

ہم نے جو اسکیم انہیں بنا کر دی وہ اگلی سطور میں پیش خدمت ہے،اس خیال سے کہ شاید کوئی اور دینی مدرسہ بھی اس پر غور کرے اور اسے مفید اور قابل عمل سمجھے۔یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس طرح کی تجاویز کی تفاصیل حتمی نہیں ہوتیں اور انہیں متعلقہ لوگوں کے ساتھ بحث و مناقشے کے بعد کمی بیشی کرکے مزید بہتر بنانے کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔

مجوزہ اسکیم

مدرسہ تعلیم و تربیت اور تحقیق کے تینوں کام مندرجہ ذیل ترتیب سے کرے:

۱۔ درس نظامی پاس ذہین طلبہ کو ایک سالہ ریفریشر کورس یا تمہیدی/ پریپ کلاس میں داخلہ دیا جائے اور انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کیا جائے۔

۔ اس ایک سالہ پروگرام کا نصاب یہ ہو: اردو، انگریزی اور عربی زبانوں میں مہارت۔ ہم عصر عمرانی اور سائنسی علوم کا تعارفی مطالعہ۔مغربی فکر و تہذیب کا تعارفی مطالعہ۔اتحاد بین

المسالک والعلماء اور ادب الخلاف ۔ اسلام کا مطالعہ بحیثیت نظام زندگی اور تہذیب۔ تزکیۂ نفس۔ درس نظامی میں پڑھے گئے علوم پر ایک طائرانہ نظر۔

۔ ان طلبہ کو ایم اے اسلامیات کا امتحان کسی پبلک سیکٹر یونیورسٹی سے بطور پرائیوٹ طالب علم دلوا دیا جائے۔

۲۔ اس کے بعد لائق طلبہ کو کسی مقامی یونیورسٹی میں ایم فل پروگرام میں داخل کرا دیا جائے۔

چونکہ یونیورسٹیوں کا ایم فل پروگرام اکثر جگہ ناقص اور برائے نام ہوتا ہے اس لیے یہ طلبہ جن کی رہائش جامعہ میں ہوگی، ان کی علمی ترقی کے لیے جامعہ ایک منضبط اور جامع پروگرام وضع کرے گی جس کا ابتدائی خاکہ درج ذیل ہے:

۔ تمہیدی سال کے موضوعات کا تسلسل: مثلاً اگر کسی کی عربی یا انگریزی کمزور ہو تو اس کی تدریس یا مغربی فکر و تہذیب کا مطالعہ جاری رکھنا یا بعض اسلامی علوم کی تدریس۔

۔ جامعہ کے اساتذہ نہ صرف طالب علم کے یونیورسٹی کے ایم فل کے تدریسی پروگرام میں اس کی معاونت کریں بلکہ یونیورسٹی میں تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے اس کی دلچسپی کے شعبے اور موضوع کے انتخاب میں بھی اس کی مدد کریں، اسے منہجِ تحقیق پڑھائیں اور عملاً اچھا تحقیقی مقالہ لکھنے میں اس کی مدد کریں... تاکہ یونیورسٹی کی تعلیم و تحقیق میں وہ ایک لائق طالب علم ہو، دوسروں سے آگے ہو، یونیورسٹی میں پوزیشن لے اور خود کو میرٹ سکالرشپ کا حق دار ثابت کر سکے اور یونیورسٹی کے اخراجات بچا سکے، نیز یونیورسٹی اور جامعہ کے لیے نیک نامی کا باعث بنے۔

یونیورسٹی سے ایم فل کے دوران طالب علم جامعہ میں رہائش پذیر رہے اور جامعہ کی علمی ،فکری اور تعلیمی سرگرمیوں میں باقاعدہ شریک رہے اس کی سہولت کے مطابق اسے جامعہ میں ایک دو پریڈ پڑھانے کی ذمہ داری بھی دی جا سکتی ہے۔

۳۔ ایم فل کے بعد طالب علم اپنی دلچسپی کے اسلامی شعبے میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لے گا۔

۔ جامعہ طالب علم کے پی ایچ ڈی میں موضوع کے انتخاب، طرز تحقیق بلکہ عملاً تحقیقی مقالہ لکھنے میں اس کی معاونت اور رہنمائی کرے تاکہ وہ اعلیٰ پائے کی اسلامی تحقیق کر سکے۔

۔ طالب علم جب تک جامعہ میں رہے گا، جامعہ اس کی رہائش، کھانے اور علاج کا انتظام کرے گی۔ اگر وہ اسی شہر میں جامعہ کی مشاورت سے کہیں اور ملازمت کر لیتا ہے تو بھی رہائش

جامعہ میں رکھے گا اور اس کی زیر نگرانی پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھے گا اور جامعہ کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں میں شرکت کرے گا۔

ہاں! اگر وہ شادی کرلے تو اسے الگ رہائش کی اجازت ہوگی (کیونکہ دنیا کے بعض بڑے تعلیمی اداروں [جیسے ایران میں قُم] کی طرح جامعہ کے پاس فیملی ہوسٹل کے وسائل فی الحال میسر نہیں ہیں) لیکن ڈاکٹریٹ کا علمی کام وہ جامعہ کی مشاورت اور مدد سے مکمل کرے گا اور زندگی بھر (بطور رکن انجمن فاضلین جامعہ) جامعہ کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں سے وابستہ رہے گا اور جب وہ برسر روزگار ہو جائے گا تو جامعہ کے ایک طالب علم کی کفالت کرے گا۔ (جامعہ بھی اگر چاہے تو یہ پالیسی وضع کرسکتی ہے اور طلبہ اور ان کے والدین سے تحریراً منوا سکتی ہے کہ وہ ان طلبہ کو ایم فل اور پی ایچ ڈی فی سبیل اللہ نہیں کرائے گی بلکہ اس کے لیے قرضِ حسنہ دے گی اور طلبہ ملازمت مل جانے کے بعد اسے قسطوں میں واپس کریں گے)۔

۴۔ جامعہ کی اس تعلیمی اسکیم کا بنیادی مقصد رجال کار کی تیاری ہے یعنی اس کے پیش نظر ایسے اساتذہ و محققین تیار کرنا ہے جو دینی علوم میں فی الحقیقت رسوخ رکھتے ہوں، کسی ایک شعبے کے ماہر ہوں، باکردار ہوں اور ملک وملت کی خدمت کرسکیں اور فرد، معاشرے اور ریاست کو اسلامی خطوط پر چلانے میں متحرک اور موثر کردار ادا کرسکیں۔ اس کے لیے جامعہ کا تعلیمی اور انتظامی ڈھانچہ اتنا فعال ہونا چاہیے اور ایسے مشنری لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے کہ جامعہ محض ایک ہوسٹل بن کر نہ رہ جائے بلکہ مذکورہ بالا مقاصد احسن طریقے سے حاصل کرے۔

۵۔ جامعہ کی تعلیمی اسکیم میں اسلامی علوم سے مراد محض قرآن، حدیث، فقہ اور عربی زبان نہ ہو، جیسا کہ مدارس میں بالعموم سمجھا جاتا ہے، بلکہ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ کی رو سے قرآن وسنت کے علاوہ، قرآن وسنت کی روشنی میں تمام علوم حکمت جو مبنی بر "سمع وبصر وفواد" ہیں (یعنی تمام عمرانی وسائنسی علوم) وہ اس میں شامل ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جامعہ کے طلبہ صرف قرآن وسنت کے مضامین میں ہی ایم فل و پی ایچ ڈی نہیں کریں گے بلکہ جو طلبہ استعداد رکھتے ہوں ان کو عمرانی علوم میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کی ترغیب دی جائے گی مثلاً اسلامی معاشیات میں، اسلامی نفسیات میں، اسلامی فلسفے میں بلکہ اسلام اور سائنس، اسلام اور ہیئت (فلکیات) اسلام اور طبیعیات... وغیرہ میں بھی ایم فل اور پی ایچ ڈی کرائی جائے گی۔ کچھ منتخب اور ذہین طلبہ کو کسی پبلک سیکٹر یونیورسٹی سے ایم اے

کرانے کے بعد مقابلے کے امتحان (CSS) میں بھی چند ماہ کی خصوصی تربیت کے بعد شریک کرایا جائے گا تاکہ بیوروکریسی میں اسلامی ذہن کے لوگ پہنچ سکیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ جو طلبہ درس نظامی اور ایم اے کے بعد اسلامی عمرانی یا سائنسی علوم میں ایم فل و پی ایچ ڈی کریں گے وہ معاشرے اور ریاست کے مختلف شعبوں میں جا کر اپنے اخلاق و کردار سے عوام میں دعوت و اصلاح کا کام زیادہ اعلیٰ پیمانے پر اور موثر انداز میں کر سکیں گے، ان شاء اللہ۔ تاہم یہ کام جامعہ کے افرادی اور مالی وسائل کے اندر رہ کر ہی کیے جا سکیں گے۔

۶۔ درس نظامی کے بعد کا یہ مرحلہ تعلیم (ایم فل و پی ایچ ڈی) درحقیقت تخصص و تحقیق کا مرحلہ ہے لہٰذا طلبہ کو جو منہج تحقیق پڑھایا جائے گا اس میں تحقیق کی اسلامی روایت اور اصولوں کے علاوہ عصر حاضر میں مروج منہج تحقیق کے دو بڑے دائروں یعنی بیانیہ تحقیق (Qualitative Research) اور سائنسی تحقیق (Ouantitative Research) کا مطالعہ بھی طلبہ کے لیے لازمی ہوگا۔

۷۔ جس طرح ثانویہ عامہ، ثانیہ خاصہ، عالیہ اور عالمیہ دینی مدارس کی ڈگریوں کے نام ہیں، اسی طرح ایم فل و پی ایچ ڈی کی ان سرکاری ڈگریوں کے اسلامی/عربی نام بھی ایجاد کیے جائیں (عرب جامعات میں انہیں ماجستیر اور دکتوراہ کہا جاتا ہے) اور حکومتی ڈگریوں کے ساتھ ساتھ مدرسہ (امتحان لینے کے بعد) یہ ڈگریاں بھی مدرسہ کی طرف سے جاری کرے۔ اس سے مدرسہ کی علمی حیثیت بھی نمایاں اور مستحکم ہوگی۔

۸۔ ہمارے زوال کے بنیادی اسباب میں جہاں نامناسب تعلیم اہم عنصر ہے وہاں تزکیہ کا نہ ہونا بھی ایک بڑی وجہ ہے لہٰذا تزکیہ سے متعلق مواد کی تدریس اور اس کی اہمیت اور مناہج پر لیکچرز کے ساتھ ساتھ طلبہ کی عملی تربیت کا اہتمام بھی جامعہ کی ذمہ داری ہوگی۔ وہ اس کے لیے باقاعدہ پروگرام اور نصاب وضع کرے گی اور ضروری اقدامات کرے گی۔

۹۔ اتحاد بین العلماء اور اتحاد بین المسالک کو ضرور زیر بحث لایا جائے گا اور اختلافات میں شدت کی بجائے طلبہ کو رواداری اور یکجہتی کے فوائد سے آگاہ کیا جائے گا اور باہم نرمی اور حسن سلوک کی تاکید کی جائے گی۔

۔ ہم تجویز کرتے ہیں کہ طلبہ کا داخلہ کسی مخصوص مسلک تک محدود نہ ہو بلکہ تمام مسالک کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے۔ اسی طرح اساتذہ کا بھی کسی ایک مسلک سے ہو ضروری نہ ہو نیز دوسرے مکاتب فکر میں سے ایک ایک سینئر عالم دین کو جامعہ کے اس پروگرام کی مجلس مشاورت میں لیا

جائے اوران کے مشورہ کو اہمیت بھی دی جائے تاکہ اس پروگرام کو وہ اپنا پروگرام سمجھیں۔

کامیابی کے لیے بعض ضروری اقدامات

اس پروگرام کو موثر اور کامیاب بنانے کے لیے جامعہ کو تین امور پر ترکیز کرنا ہوگی:

۱۔ دینی مدارس سے ذہین طلبہ کے حصول کو ممکن بنانے کے لیے جامعہ کو چاہیے کہ دینی مدارس کے علماء، خطباء اور دورۂ حدیث کے آخری سال کے طلبہ کو ایک یا دو دن کے لیے جامعہ میں سیمینار/ تربیتی کورس کے لیے بلایا جائے اور جن باتوں کا اوپر ذکر ہوا، ان کا خلاصہ ان کی خدمت میں پیش کیا جائے اور اتحاد بین المسالک، تفہیم مغرب اور موجودہ حالات میں علماء کی ذمہ داریوں اور کردار کے حوالے سے ان کے سامنے دردِ دل رکھا جائے اور ان کو اپنے ساتھ ملایا جائے۔

ان تربیتی پروگراموں میں سارے مسالک سے علماء کرام کو بلایا جائے اور مقررین و مربیین حضرات میں بھی مختلف مسالک کے موزوں اساتذہ شامل ہوں۔ جامعہ اس پروگرام کی ابتداء لاہور سے کرے اور پھر بتدریج اس کو سارے پاکستان تک پھیلانے کی کوشش کرے۔ یہ تربیتی پروگرام جامعہ کا مستقل پروگرام ہو اور سارا سال چلتا رہے۔

۲۔ درس نظامی میں عموماً مڈل یا میٹرک پاس طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اس مڈل یا میٹرک میں طلبہ کو کیا پڑھایا جاتا ہے؟ اس کی فکرمندی بہر حال ضروری ہے۔ مدارس کو چاہیے کہ اس امر کا جائزہ لیں اور اسے بہتر بنانے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالیں یا مدارس خود اس کی تدریس شروع کر دیں اور اس میں اپنی مرضی سے غیر سرکاری طور پر اضافے کر لیں۔

اور اسی طرح خود درس نظامی پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے جیسا کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ اور دوسرے بہت سے اہل علم اس کا اظہار ماضی میں بھی کرتے رہے ہیں اور آج بھی کرتے رہتے ہیں۔

۳۔ جامعہ کو اس پروگرام کی کامیابی کے لیے بہترین اساتذہ اکٹھے کرنا ہوں گے۔ اس کے لیے دینی مدارس سے بھی موزوں اساتذہ کی خدمات حاصل کی جائیں اور یونیورسٹیوں کے شعبہ علوم اسلامیہ کے ریٹائرڈ پروفیسروں میں سے مناسب آدمی تلاش کیے جائیں اور ان کے ساتھ تبادلہ خیال کی نشستیں رکھ کر انہیں جامعہ کے مقاصد کے لیے ایثار و محنت کی درخواست ان سے کی جائے۔ هذا من عندنا والعلم عند الله

نوٹ: اگر کوئی صاحبِ علم ہماری اس تجویز کے حسن و قبح پر روشنی ڈالنا چاہیں تو البرہان کے صفحات حاضر ہیں۔

تعلیم و تحقیق

سید خالد جامعی

مطالعۂ مغربی فکر و تہذیب: کتابیات و مآخذ

(اُردو، عربی، انگریزی)

مغربی فکر و تہذیب کی تفہیم کے لیے مطالعہ ناگزیر ہے لیکن کیا پڑھا جائے؟ ایک ٹھوس جواب کے ذریعے ہی سوال کا حق ادا ہو سکتا ہے اور اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ان حقائق کے شعور کے لیے کم از کم دو سو اردو اور انگریزی کتب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ممکن ہے یہ تعداد بہت زیادہ محسوس ہو لیکن ان کتابوں کا مطالعہ کیے بغیر شاید ہم مغرب کے بطن میں مضمر کفر کو نہ سمجھ سکیں۔ یہ فہرست اب بھی مختصر ہے اس لیے کہ مغرب کو سمجھنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ تہذیبوں کے تصادم، مغربی فکر و فلسفے کے ادراک، تفہیم و تسہیل، سرمایہ داری اور عیسائیت کی تاریخ اور یونانی فلسفہ و سائنس کے عیسائیت پر مرتب ہونے والے اثرات کو سمجھنے کے لئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ سود مند رہے گا:

(۱) تھافۃ الفلاسفۃ: از امام غزالیؒ (م ۱۱۱۱۔۱۰۵۸ء) یہ اسلامی اور مذہبی فکر کے تصادم کے بارے میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی کتاب ہے۔ کلاسیکی یونانی فلسفہ تراجم کے ذریعے مسلم مفکرین پر گہرے اثرات مرتب کر رہا تھا۔ تہافتہ الفلاسفۃ میں فارابی اور ابن سینا کے فلسفوں اور ان کی فکر کے بنیادی نکات کا جواب دیا گیا ہے۔ غزالی نے یونان کے زیر اثر مسلم فلسفیوں کی فکر کو ۲۰ بنیادی مسائل میں ڈھالا اور ان کا جواب لکھا۔

(۲) تھافۃ التھافہ: از ابن رشد (۱۱۹۸۔۱۱۲۶ء) یہ کتاب امام غزالیؒ کی تہافتہ الفلاسفہ کا جواب ہے، (یہ کتاب امام غزالیؒ کے انتقال کے بعد شائع ہوئی)۔ تہذیبی فکر کے تصادم سے دلچسپی رکھنے والے اگر یہ دیکھنا چاہیں کہ یونانی فکر کا حملہ کتنا شدید تھا اور امام غزالیؒ نے تہافتہ میں اس کا کیا جواب دیا اور تہافتہ پر تنقید کرنے والوں نے غزالیؒ پر کیا نقد فرمایا؟ اس نقد کی سطح کیا تھی؟ یہ کتاب امام غزالی کے فکر پر تمام نقد کا احاطہ کرتی ہے، اس لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

(۳) الرد علی المنطقیین: از علامہ ابن تیمیہؒ، اس کتاب میں امام ابن تیمیہؒ نے یونانی فکر کے مسلم فکر پر اثرات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، مسلم مفکرین کے یہاں یونانی اثرات کی

نشاندہی کی ہے اور یونانی فکر کا رد کیا ہے۔

(۴) مکتوبات امام ربانی: کامل از مجدد الف ثانیؒ۔ یہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ ان مکتوبات میں اسلامی عقائد کا بیان ہے اور کئی خطوط میں اسلامی اور غیر اسلامی عقائد کے امتیازات اور اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیبوں کی عدم مطابقت کے بنیادی امور بیان کیے گئے ہیں۔

(۵) الرسالة الحميدية: از شیخ آفندی

(۶) الانتباہات المفیدہ فی الاشتباہات الجدیدہ: از حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ اس کا انگریزی ترجمہ محمد حسن عسکری نے An Answer to Mod ernism کے نام سے کیا ہے۔

(۷) عقلیات اسلام: از مولانا مصطفی خان بجنوری۔ یہ کتاب الانتباہات کی تسہیل وتشریح ہے۔ اصل رسالہ ۷۰ صفحات کا ہے اور تشریح چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ رسالہ انتباہات کی تسہیل وتشریح نہایت عمدہ طریقے سے کی گئی ہے اور عقل و منطق کی نارسائیاں نہایت عمدہ دلیلوں سے واضح کی گئی ہیں۔ انداز بیان سادہ اور دل نشین ہے، اگر اس کتاب کو غور سے پڑھا جائے تو سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کے غبار سے چندھیانے والی آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں۔ عرصہ سے اس کتاب کی اعلیٰ طباعت پر کسی نے خاص توجہ نہیں دی البتہ اب مکتبۃ البشریٰ کراچی نے اعلیٰ طباعت سے آراستہ کر کے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

(۸) الكلمة الملهمة: از اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلویؒ

(۹) کلیات اکبر الہ آبادیؒ: اکبر الہ آبادی ہمارے عظیم ترین شاعروں میں سے ہیں۔ تہذیبوں کے تصادم کے ابتدائی مراحل دیکھنے ہوں تو اکبر کی شاعری پڑھنا ناگریز ہے، اکبر کی عظمت یہ ہے کہ اقبالؒ تک ان کے زیر اثر رہے ہیں۔ اکبر کی تخلیقی سطح اقبال کے ہم پلہ ہے، فرق یہ ہے کہ اکبر نے جو بات طنز و مزاح کے پیرائے میں کہی ہے اقبال اسے ایک بڑے فکری کینوس میں اعلیٰ ترین سنجیدہ سطح پر بیان کرتے ہیں۔ کلیات اکبر الہ آبادی کے مطالعے کی تجویز ممکن ہے بعض طبائع پر گراں گزرے لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ اکبر الہ آبادی نے طنزیہ شاعری کے ذریعے تہذیب وفلسفہ مغرب کے خلاف بند باندھنے کی کتنی زبردست کوشش کی۔ ان کے اس کام کی اہمیت شاعر مشرق پر خوب روشن تھی اسی لئے علامہ اقبالؒ اپنے خطوط میں حضرت اکبرؒ کو اپنا پیر قرار دیتے، ان کا شرف نیاز حاصل کرنا چاہتے اور اپنا دل حضرت اکبرؒ کے سامنے چیر کر رکھنا چاہتے

تھے اقبال خود کو لاہور میں تنہا سمجھتے اور حضرت اکبرؒ کو وہ فرد واحد جانتے جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جاسکے۔ وہ اکبر سے طویل خط لکھنے کی استدعا کرتے اور اس خواہش کو روحانی خودغرضی قرار دیتے۔ وہ حضرت اکبرؒ کو پیر مشرق قرار دیتے تھے۔ حضرت اکبر کے بارے میں اقبال نے یہاں تک لکھا کہ ''اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا قطعاً رنج نہیں بلکہ خوشی ہے۔ خط و کتابت سے پہلے آپ سے جو ارادت وعقیدت تھی ویسی اب بھی ہے اور انشاء اللہ جب تک زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی''، اقبال نے چند اشعار حضرت اکبر کے رنگ میں بھی لکھے مگر عوام کی بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ سے کچھ سمجھ لیا۔ اقبال کے خیال میں حضرت اکبر نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ (شعر) میں بند کر دیا تھا واضح رہے کہ اقبال ہیگل کو بہ اعتبار تخیل افلاطون سے بڑا فلسفی تصور کرتے تھے حضرت اکبر کے خطوط سے اقبال پر غور وفکر کی راہیں کھلتیں اس لئے اکبر کے خطوط وہ محفوظ رکھتے۔ حضرت اکبر کے اشعار پڑھ کر اقبال کو شیکسپئر اور مولانا روم یاد آ جاتے تھے اقبال شکوہ جواب شکوہ پر دس پندرہ سطور کا دیباچہ ناشر کے مطالبے پر حضرت اکبر سے لکھوانے کے خواہش مند تھے۔ (اقبال نامہ، ص ۳۷۲، ۳۷۴، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۹۳، ۳۹۷ یک جلدی تصحیح وترمیم شدہ، اقبال اکادمی پاکستان ۲۰۰۵)۔ علامہ اقبالؒ کے اِن افکار سے ''کلیات اکبر الہ آبادی'' کی اہمیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

(۱۰) اقبالؒ کی ساری اردو اور فارسی شاعری اور کم از کم ضربِ کلیم جو اس اعلان کے ساتھ شائع ہوئی ''ضربِ کلیم یعنی اعلان جنگ دورِ حاضر کے خلاف خطبات اقبال سے اقبال نے رجوع کر لیا تھا لہٰذا اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندویؒ کے افکار جو خطبات پر عالمانہ نقد ہیں، جریدہ شمارہ ۳۳، میں بنام امالی غلام محمد کے نام سے ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

(۱۱) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی: از مولانا مودودیؒ

(۱۲) انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل: از مولانا مودودیؒ

(۱۳) تفہیمات: از مولانا مودودیؒ

(۱۴) تنقیحات: از مولانا مودودیؒ

(۱۵) الجہاد فی الاسلام۔: از مولانا مودودیؒ

(۱۶) رسائل ومسائل پانچ حصے: از مولانا مودودی۔ ان میں عہد حاضر کے متکلمانہ مسائل کا انتخاب نظر آئے گا اور جدید ذہن کے شبہات سامنے آئیں گے۔

(۱۷)مغربی فکر وفلسفے کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ،خطبات لاہور: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

18 A Cas Against Capitalism:Dr Javaid Akber Ansari

19 Buisness Ethices in Pakistan:Dr Javaid Akber Ansari

20 Money and Banking in Pakistan:Dr Javaid Akber Ansari

21 Financial Menagement in Pakistan:Dr Javaid Akber Ansari

(۲۲)قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل: از ڈاکٹر برہان احمد فاروقی۔اس کتاب کا آخری باب جدید اسلامی فکر میں اقبال کی اہمیت ص ۲۱۵ تا ۲۹۲ پر محیط ہے۔ڈاکٹر صاحب کا انگریزی میں غیر مطبوعہ مقالہ Iqbal's Reconstruction بھی اہمیت کا حامل ہے،فاروقی صاحب کے شاگرد خضر یاسین کی تحقیق کے مطابق خطبات پر سید سلیمان ندوی کی تنقید اور برہان فاروقی کی غیر مطبوعہ انگریزی کتاب کے الفاظ،خیالات اور افکار میں غیر معمولی توارد ہے۔اس سلسلے میں جریدہ ۳۴اور اقبال اکادمی کی کتاب ''میارا بزم برساحل کہ آنجا'' کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔

(۲۳) خطبات اقبال نئے تناظر میں: از محمد سہیل عمر،علامہ اقبال کے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کا پہلا فلسفیانہ ناقدانہ جائزہ ہے۔اس کتاب کے ذریعے فکر وفلسفہ و تہذیب مغرب کے پیدا کردہ الحاد شکوک،شبہات،سوالات اعتراضات اور واہمات کی مکمل تصویر سامنے آتی ہے۔عہد جدید کے اذہان میں پیدا شدہ ان سوالات کا جواب عقلیات کی روشنی میں دینے کی کوشش مختلف مفکرین اور متجددین نے کی ہے،اس کا ناقدانہ جائزہ بھی سامنے آتا ہے، سہیل عمر نے اس کتاب کو برہان احمد فاروقی صاحب کے املی قرار دیا ہے،جبکہ یہ محض اظہار عجز ہے اور سہیل عمر کی سعادت مندی اور احسان شناسی۔

(24) History of Islamic Philosophy: Dr Syed Hossein Nasr

حسین نصر کی تمام کتابیں اہمیت کی حامل ہیں ان کے فکر سے ہمیں اختلاف ہے،لیکن ان میں بہت اہم نکتے ملتے ہیں۔

(۲۵)خطبات اقبال۔ایک مطالعہ: ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی۔اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ علوم اسلامی کی باقاعدہ تحصیل اور عربی زبان پر عبور کے بغیر اجتہاد اور روشن خیال افکار پیش کرنے کے دعوے دار کس قدر اغلاط کرتے ہیں اور قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں۔

(۲۶)قرآن اور علم جدید: ڈاکٹر رفیع الدین،ڈاکٹر صاحب کی دیگر کتابوں میں بھی کام کے

نکتے ملتے ہیں۔

(۲۷) مائیکل مین کی معرکہ آراء کتاب *The Dark Side of Democracy* یہ کتاب جمہوریت کے اصل چہرے سے نقاب الٹتی ہے اور تاریخی اعداد وشمار سے ثابت کرتی ہے کہ جمہوریت جہاں بھی گئی قتل و غارت گری لے کر گئی اور بیسویں صدی دنیا کی خوں خوار ترین صدی تھی۔ مائیکل مین نے اعداد وشمار اور حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ اسلام تمام مذاہب میں سب سے زیادہ پر امن مذہب ہے اور اس کی تاریخ اجلی تاریخ ہے۔ جمہوریت کے تمام مداحوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ لازمی ہے، اگر مداحان جمہوریت کی نظر سے یہ کتاب گزر جائے تو شاید وہ جمہوریت ترک کر دیں، جمہوریت نے جس طرح خوں ریزی کی اور ایک ارب انسانوں کا قتل عام کیا، ہمارے اکثر دانشور اس سے تاریخ سے ناواقف ہیں۔

(۲۸) مریم جمیلہ صاحبہ کی تمام کتابیں خصوصاً 'اسلام ایک نظریہ ایک تحریک' اور *Islam and Modrenism*۔ مریم جمیلہ صاحبہ کے وہ تمام تبصرے جو مختلف کتابوں پر وہ Muslim World Book Review میں سالہا سال تک کرتی رہیں۔

(۲۹) جدیدیت: یعنی مغربی فکر کی گمراہیوں کا خاکہ از محمد حسن عسکری۔

(۳۰) وقت کی راگنی: از محمد حسن عسکری

'جدیدیت' مغربی فکر کے زوال اور اس کے ہولناک اثرات کی مختصر ترین تاریخ ہے جبکہ وقت کی راگنی ہمیں بتاتی ہے کہ اردو ادب کی روایت کیا ہے اور وہ مغربی روایت سے کتنی مختلف ہے۔ محمد حسن عسکری کے مندرجہ ذیل مضامین وانٹرویو وغیرہ کا مطالعہ بھی از حد مفید رہے گا۔

☆ مذہبی شاعری، یہ گفتگو لفظ میں شائع ہوئی تھی ☆ محراب اور سات رنگ میں عسکری صاحب کے شائع شدہ مضامین ☆ محسن کاکوروی کی نعت ☆ پیروی مغرب کا انجام ☆ اردو کی ادبی روایت کیا ہے ☆ بارے آموں کا کچھ بیان ہو جائے ☆ جزیرے کا دیباچہ ☆ روح کی تلاش ☆ ادب میں اخلاقی مطابقت ☆ ہمارا ادبی شعور اور مسلمان ☆ اسلامی فن تعمیر کی روح ☆ مغرب میں مسلمانوں کے تبلیغی وجود ☆ مکاتیب عسکری مرتبہ شیما مجید ☆ مضامین عسکری شیما مجید ☆ مشرق و مغرب کی آویزش اردو ادب میں ☆ شب خون میں احمد جاوید اور آصف فرخی کا مکالمہ نیز شب خون البلاغ میں عسکری کے مضامین۔

(۳۱) نئی نظم اور پورا آدمی: از سلیم احمد

(۳۲) مشرق ہار گیا از سلیم احمد

نئی نظم اور پورا آدمی اردو تنقید کی نہایت ہنگامہ خیز اور اہم کتابوں میں سے ہے۔ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ مغربی فکر کے زیر اثر ہمارے ادب سے کس طرح پورے آدمی یا Whole Man کا بیان تحلیل ہوا اور اس کی جگہ ادھورے آدمی کا بیان در آیا۔ سراج منیر نے سلیم احمد کے تصور کو مابعد الطبیعیاتی سطح کا نظریہ قرار دیا ہے۔

'مشرق سلیم' احمد کی ایک طویل نظم ہے جس میں مغربی فکر کے زیر اثر مسلم معاشروں میں اقدار کی شکست و ریخت اور علامتوں کی تبدیلی کو بیان کیا گیا ہے۔

(۳۳) معرکہ مذہب و سائنس: ترجمہ مولانا ظفر علی خان

(۳۴) سائنس اور مذہب: عبدالباری ندوی

(۳۵) صدق اور صدق جدید: مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کے تمام رسالے، ہر رسالے میں کوئی نہ کوئی نکتہ مل جاتا ہے جس سے مغربی فکر و فلسفے کی تردید ہوتی ہے۔

(۳۶) : M M Sharif A History of Muslim Philosophy

(۳۷) عالم اسلام دجالی تہذیب کی زد میں، عبدالماجد دریا آبادی: مرتب حافظ محمد موسیٰ بھٹو

(۳۸) ملت اسلامیہ اور عصر حاضر کے تقاضے، عبدالماجد درآبادی: مرتب حافظ محمد موسیٰ بھٹو

(۳۹) اسلام مسلمان اور تہذیب جدید، عبدالماجد درآبادی: مرتب حافظ محمد موسیٰ بھٹو

(۴۰) بیسویں صدی کے اسلامیت کے ممتاز شارحین، محمد موسیٰ بھٹو

(۴۱) تعلیمات مجدد الف ثانیؒ، محمد موسیٰ بھٹو

حافظ محمد موسیٰ بھٹو ماہنامہ بیداری بھی شائع کرتے ہیں۔ یہ رسالہ مختلف النوع مضامین کا گلدستہ ہے۔ اس میں مغرب، فکر مغرب، فلسفۂ مغرب پر شائع شدہ مضامین کتب تقاریر کا خوبصورت انتخاب پیش کیا جاتا ہے (بعض مضامین جدیدیت کی تائید بھی کرتے ہیں کیونکہ مضمون نگار علماء اور مفکر مغربی فکر و فلسفے سے واقف نہیں ہوتے لہٰذا سادہ لوحی کے باعث اخلاص سے

مغرب اور جدیدیت کے بعض مظاہر کی اسلامی توثیق کردیتے ہیں۔لیکن ایسا شاذ ہوتا ہے)

(۴۲) سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت: از ڈاکٹر ظفر الحسن۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں سرسید احمد خان اور مولانا حالی نے کس طرح مغربی تہذیب کی اصطلاح Nature کو غلط سمجھا اور اس کا اطلاق ادب کے ساتھ اسلام پر بھی کرڈالا جس کے تباہ کن فکری نتائج برآمد ہوئے۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ لفظ''نیچر''عیسائی، ہندو، جدید مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں کن کن معنوں میں استعمال ہوا اور ان معنوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس موضوع پر اس سے زیادہ اچھی کتاب شاید ہی کبھی لکھی گئی ہو۔

(۴۳) افکار سرسید: از ضیاءالدین لاہوری

(۴۴) حیات سرسید: از ضیاءالدین لاہوری

(۴۵) نقش سرسید: از ضیاءالدین لاہوری

یہ کتابیں ضیاء الدین لاہوری صاحب کی چالیس سالہ تحقیقی کاوشوں کا حاصل ہیں ان کتابوں میں مصنف نے موضوعات کے اعتبار سے سرسید کی فکر کو ان کی اصل تحریروں سے اقتباسات کی صورت میں جمع کردیا ہے اور اس کتاب میں سرسید کی فکر کا نچوڑ سمٹ آیا ہے۔ واضح رہے کہ برعظیم پاک و ہند میں جدیدیت کے بانی سرسید ہیں (گوکہ اس کا آغاز کرامت علی جونپوری سے ہوا) لہٰذا سرسید کی فکر کو اس کے سیاق وسباق بلکہ سرسید کے اصل الفاظ میں پڑھنا نہایت ضروری ہے۔ سرسید کے اثرات کا اپنے عہد کے بڑے بڑے لوگوں پر اثر تھا۔ بڑے بڑے نامی گرامی شخصیات تک سرسید کے اثرات سے بچ نہ سکے اور ان کے افکار میں جدیدیت کا زہر سرسید کی تعلیمات کا اثر ہے۔ اس وقت سرسید کی تمام تحریریں ان بزرگوں کے سامنے نہیں تھیں، خصوصاً سرسید کا وہ خط جس میں وہ قرآن کو کلام اللہ نہیں بلکہ کلام رسول اللہ قرار دیتے ہیں، یہ جرأت اسلامی تاریخ میں خوارج معتزلہ اور کسی گمراہ فرقے کو بھی نہ ہوئی۔ اگر یہ خط ان اکابرین کے سامنے ہوتا تو وہ سرسید کو رد کردیتے۔

(۴۶) ایران سے شائع ہونے والا رسالہ [ThoughtEcho of Islam] سہ ماہی، مدیر محمد سلیمی

(۴۷) The Decline of the West by Oswald Spengler

مغربی تہذیب کے بارے میں اس کتاب کا شمار مغربی ادب کے کلاسک میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب پہلی جنگ عظیم سے قبل لکھ لی گئی تھی مگر شائع ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ یہ کتاب مغربی تہذیب کی بنیادوں، کلاسکی یونانی فکر اور مغربی تہذیب کے مرحلہ بہ مرحلہ زوال کو بیان کرتی ہے۔ اسے پڑھے بغیر مغربی فکر کے بحران کا اندازہ دشوار ہے۔ اس کا ترجمہ 'زوال مغرب' کے نام سے اکادمی ادبیات شائع کر چکی ہے۔

(۴۸) رینے گینوں کی تین اہم کتابیں:

[A] The Reign of the Quantity,
[B]Crisis of the Modern World,
[C] East and West

رینے اسلام لانے کے بعد شیخ عبدالواحد عیسیٰ کہلائے۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے قبل رینے کے فکر کا جائزہ جریدہ ۳۵ میں ملاحظہ کیجیے کیونکہ روایت کا مکتبہ فکر وحدت ادیان کی گمراہی کا مبلغ ہے۔ احمد جاوید اور تحسین فراقی نے لاہور میں مارٹن لنگز سے براہ راست پوچھا کہ آپ روایت کی جو بات کرتے ہیں تو کیا اس کا مطلب یہی ہے کہ تمام مذاہب برحق ہیں اور کوئی الحق نہیں تو مارٹن لنگز نے برجستہ جواب دیا جی ہاں آپ بالکل درست سمجھے ہیں (یہ روایت تحسین فراقی صاحب نے سید خالد جامعی سے خود بیان کی)

(۴۹) رینے کے معاصر آنند کمار سوامی کی دو کتابیں:

[A] Figure of Speech or Figure of Thought,[B] What is Civilization?

دوسری کتاب بتاتی ہے کہ مذہبی تہذیبوں میں لفظ تہذیب کے کیا معنی رہے ہیں اور جدید مغربی تہذیب اسے کس مفہوم میں استعمال کرتی ہے، پہلی کتاب ثابت کرتی ہے۔ کہ جدید مغربی فکر آرٹ اور تخلیق کے تصور کو پست سے پست تر کر کے اس سطح پر لے آتی ہے جہاں انسان، حیوان اور پودوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔

(۵۰) شواں کی درج ذیل کتابیں: شواں کا تعلق بھی روایت کے گمراہ مکتب فکر سے ہے۔

[A] DIMENSIONS OF ISLAM.
[B] TO HAVE A CENTER.

[C] FORGOTTEN TRUTH

فکر مغرب کو سمجھنے کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ لازمی ہے۔

[1]	Judaism and Rise of Capitalism	ZAMBAT
[2]	Sources of Self	Charles Taylor
[3]	I & Thou	Martin Boober
[4]	Being and Nothingnes	Sarter
[5]	Capitalism Shezophrenic life style	Dlues
	Anti Edipus [Volume I]	
	Anti Platious [Volume II]	
[6]	Madness & Civilization	Focualt
[7]	Dicipline and punishment	Focualt
[8]	History of Sexuality [Three Volumes]	Focualt
[9]	The Archiology of Knowledge	Focualt
[10]	The Birth of Clinic	Focualt
[11]	Contigency Irony and solidarity	Richard Rorty
[12]	Achieving our country	Richard Rorty
[13]	Objectivity Vol. I & II	Richard Rorty
[14]	Post Structurallism and Post modernism Madhan Surup	
[15]	Enlightenment Wake	John Gray.
[16]	History of Muslim Thought	Majid Fakhri
[17]	Philosophy and Islam	M. Watt
[18]	Islam.	A. R Gibbs
[19]	Platuo,	A.E. Taijlor
[20]	An introduction of Greek Thoghts	Guttehery
[21]	An introduction of Greek Thoughts	STAC
[22]	The Classics of westren philosophy	[one volume.]
[23]	Being & Existence	

Broke کی اس کتاب کا دیباچہ ہائیڈیگر نے لکھا ہے، یہ کتاب *Being & Time* کی شرح ہے اور اتنی عمدہ شرح کہ ہائیڈیگر نے دیباچے میں لکھا کہ میرے خیال کے قریب کتاب ہے۔

(جاری ہے)

تزکیۂ نفس　　ڈاکٹر محمد امین

تزکیۂ نفس اور عصر حاضر

تزکیۂ نفس کا مفہوم، ضرورت اور اہمیت۔ تصوف کا کردار اور عصر حاضر میں اس پر نظر ثانی کی ضرورت

تزکیۂ نفس: مفہوم اور اہمیت

تزکیہ کا مادہ عربی زبان میں زک و ہے۔ لفظ زکوۃ اسی سے ہے جو عربی اور اردو میں عام مستعمل ہے۔ جسے ہم عرف عام میں 'زکوۃ' کہتے ہیں وہ دراصل 'زکوۃ المال' [۱] ہے یعنی مال کی زکوۃ نکالنا۔ زک و میں لغوی لحاظ سے دو مفہوم شامل ہوتے ہیں: ایک اسے میل کچیل سے اور گرد و گندگی سے پاک وصاف کرنا اور دوسرے اس کی چمک دمک میں اضافہ کرنا، اسے جلا دینا۔ گویا زکوۃ المال کا مفہوم یہ ہے کہ مال کماتے ہوئے اور اسے خرچ کرتے ہوئے ہم سے جو کوتاہی ہوگئی، جو معصیت ہوگئی مال پر سے اس کے برے اثرات مٹانے کے لیے کچھ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا تاکہ وہ پاک وصاف ہوجائے، اجلا ہوجائے۔ ہمیں یاد آجائے کہ مال تو دراصل اللہ تعالیٰ کا ہے ہم تو محض اس کے امین ہیں اور ہمارا کام یہ ہے کہ اسے کمانے اور خرچ کرنے میں اللہ تعالیٰ (یعنی اصل مالک) کے احکام وتعلیمات کا خیال رکھیں، تاکہ ہمارے دل مال کی بڑھی ہوئی اور اپنی اصل سے تجاوز کرتی ہوئی اس کی محبت سے پاک ہوجائیں اور جو لوگ کسی وجہ سے مال کمانے میں پیچھے رہ گئے ہیں، ان محتاجوں اور مسکینوں کی کچھ مدد ہوجائے۔

اسی طرح رمضان کے آخر میں ہم جو 'فطرانہ' دیتے ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ میں دراصل 'زکوۃ الفطر' [۲] ہے یعنی روزہ رکھتے ہوئے ہم سے روزہ کے حقوق پوری طرح ادا کرنے میں جو کمی کوتاہی رہ جاتی ہے اس کا ازالہ ہوجائے اور اس ازالے کے لیے ہم کچھ مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تاکہ ہمارے روزے مقبول ہوجائیں اور تاکہ روزوں کی تکمیل پر جو خوشی (عید الفطر) ہم منا رہے ہیں اس میں غریب اور محتاج بھی شریک ہوسکیں۔

---

[۱] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۷۲۸۴، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۳۲

[۲] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۱۵۰۴

اسی طرح جب تزکیے کی نسبت نفس کی طرف ہو اور ہم 'تزکیۂ نفس' کی اصطلاح استعمال کریں تو اس کا مطلب ہوتا ہے نفس کو میل کچیل سے بچانا اور اس کے اجلے پن میں اضافہ کرنا یعنی نفس کو اللہ کی معصیت کی میل کچیل سے بچانا اور اللہ کی تعلیمات پر کماحقہٗ عمل کر کے اسے مزید اجلا کرنا۔ گویا اللہ تعالیٰ کے نواہی سے بچنا اور اس کے اوامر پر کماحقہٗ عمل کرنا۔ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ نفس کی ایسی تربیت اور ایسی حالت کہ وہ طبعاً اور بخوشی ان باتوں پر عمل کرنے لگے جن کا اللہ حکم دیتا ہے (یعنی اوامر) اور ان امور سے بچنا پسند کرنے لگے جن سے بچنے کا اللہ حکم دیتا ہے (یعنی نواہی) گویا تزکیۃ النفس کا مطلب ہے نفس کو اللہ تعالیٰ کی معصیت کی میل کچیل سے بچانا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں خوبی و کمال پیدا کر کے اسے مزید اجلا کرنا اور چمکانا۔

مقصدِ بعثتِ انبیاء

مندرجہ بالا وضاحت سے پتہ چلا کہ نفس انسانی کی ایسی تربیت اور ایسی حالت کہ وہ طبعاً اور بخوشی اللہ تعالیٰ کے اوامر پر عمل اور اس کے نواہی سے اجتناب کرنے لگے، دین کی ایک بنیادی ضرورت اور مطالبہ ہے کہ اس کے بغیر نہ آدمی اسلام قبول کر سکتا ہے اور نہ اس پر عمل کر سکتا ہے۔ اس لیے نفس کے اس تزکیے کو اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کی بعثت کا اصل مقصد قرار دیا چنانچہ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ:

❁ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿14﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿15﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿16﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿17﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿18﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿19﴾ [الاعلیٰ ۸۷: ۱۴ تا ۱۹]

❁ اور حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿43﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿44﴾

[طٰہٰ ۲۰: ۴۳، ۴۴]

اور نبی خاتم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں قرآن حکیم میں چار [1] دفعہ آیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمے جو کام لگایا ہے وہ ہے [illegible] زت۔

---

[1] البقرہ ۲: ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران ۳: ۱۶۴، الجمعہ ۶۲: ۲

(یعنی وہ [پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم] انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے)۔

تعلیمِ کتاب وحکمت ذریعہ ہیں تزکیۂ نفس کا

ان آیات میں تزکیہ کا ذکر تلاوت وتعلیم کتاب اور تعلیم حکمت سے پہلے بھی آیا ہے اور اس کے بعد بھی جو اس بات کا مظہر ہے کہ تعلیم کتاب وحکمت کا نتیجہ اور حاصل تزکیۂ نفس ہونا چاہیے اور ویسے بھی منطقی طور پر تعلیم کا نتیجہ تربیت نفس ہوتا ہے اور ہم سب کا روزمرہ کا مشاہدہ بھی یہی ہے کہ تربیتِ نفس نتیجہ ہوتی ہے۔ تعلیم کا قرآنِ حکیم جسے 'تزکیہ' کہتا ہے شعبہ تعلیم والے اسے 'تربیت' کہتے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ تعلیم (یعنی تعلیم کتاب وحکمت) ذریعہ ہے تزکیۂ نفس کا یا ہم اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم کی غایت تزکیۂ نفس ہے اور تزکیے کی غایت یہ ہے کہ آدمی نفس کی ایسی تربیت کرے کہ زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزارنا اس کے لیے سہل ہو جائے اور اس کی خوشی بن جائے اور اس امر عبادت واطاعت کی غایت یہ ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے راضی اور خوش ہو جائے اور اسے اپنی نعمتوں سے نوازے جو ہر مسلمان کی غایت الغایات ہے ۔گویا اللہ تعالیٰ انبیاء ورسل اس لیے مبعوث فرماتا ہے تاکہ وہ تعلیم کتاب وحکمت سے لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کریں تاکہ وہ اللہ کی عبادت اور اطاعت کی زندگی گزار سکیں اور آخرت میں اللہ کی رضا اور خوشنودی اور اس کی نعمتوں سے متمتع ہو سکیں۔

تصوف کی ابتداء وارتقا

یہی وجہ ہے کہ اس امت کے چوٹی کے علماء وصلحا نے (جیسے حضرت حسن بصریؒ ،جنہیں محدثین ''امیر المومنین فی الحدیث'' کا لقب دیتے ہیں] اور حضرت ثابت بنانیؒ ، مالک بن دینارؒ اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جو استاد ہیں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اور حضرت بشر حافیؒ ، جو ممدوح ہیں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے، زہد اور بکاء کے جس رویے کو عام کرنے کی کوشش کی وہ بالآخر 'تصوف' کے نام سے ایک ادارے کی صورت اختیار کر گیا (صوفی کا مطلب ہے صوف یعنی اون کے سادہ اور موٹے جھوٹے کپڑے پہننے والا) اور مسلم معاشرے میں اس ادارے کی مقبولیت کا

یہ عالم تھا کہ تیسری صدی ہجری کی ابتداء میں عالم اسلام کا کوئی شہر (مکہ ومدینہ سمیت) بلکہ قصبہ ایسا نہیں تھا جس میں خانقاہ / زاویہ / رباط (یعنی مرکز تربیت و تزکیۂ نفس) موجود نہ ہو۔ اس ادارے کے ذریعے کروڑوں لوگوں نے اپنے نفوس کا تزکیہ کرنے اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کی عملی تربیت حاصل کی جس میں اس امت کے بڑے مرتبے کے علماء وصلحاء (جیسے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ، امام ابن جوزیؒ امام غزالیؒ وغیرہم) شامل ہیں۔ اس ادارے (تصوف) کے دو بنیادی اصول تھے ایک کثرتِ ذکر اور دوسرے صحبتِ صالح اور یہ دونوں اصول قرآن وسنت پر مبنی تھے۔ اور اس ادارے کی غایت تھی تزکیۂ نفس تا کہ لوگ اپنے نفوس کو شریعت پر عمل کا خوگر بنا سکیں۔

اس ادارے نے صدیوں تعمیری اور مفید انداز میں کام کیا اور کروڑوں لوگوں کی اصلاح کی لیکن امت جب زوال پذیر ہوئی اور اس کے سارے شعبوں میں زوال آیا تو تصوف کا یہ ادارہ بھی کمزور و مضمحل ہو گیا اور اس میں بہت سی بدعات وخرافات اور غیر اسلامی تصورات اور رسوم ورواج داخل ہو گئے۔ یوں تصوف کا نام باقی رہ گیا، کام باقی نہ رہا۔ اور ہمارے عہد تک آتے آتے اس نے مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی کہ لوگوں نے تصوف کو خاندانی کاروبار بنالیا اور اسے سیاسی اثر ورسوخ اور اقتدار تک پہنچنے کا ذریعہ بنالیا اور یوں یہ ادارہ مذہب اور تزکیۂ باطن کے نام پر لوگوں کو ٹھگنے اور بھٹکانے کا ایک ذریعہ بن گیا۔ گویا کارِ طفلاں تمام خواہد شد۔

عصر حاضر میں تزکیۂ نفس کی جہتیں

عصر حاضر میں تزکیۂ نفس کے حالات اور اس کی نوعیت کی کئی جہتیں ہیں مثلاً:

i۔ تصوف میں غیر اسلامی تصورات اور رسوم ورواج کے داخل ہونے خصوصاً متاخرین صوفیہ میں رہبانیت کے جراثیم داخل ہونے اور تصوف کے محض ذکر وفکر پر قناعت کرنے اور اس کے اثرات مسلمانوں کی اجتماعی، سیاسی، معاشرتی اور عملی زندگی پر نہ پڑنے کا جو ماحول پیدا ہو گیا، اس کی وجہ سے اور اس کے ردّ عمل کے طور پر عصر حاضر میں ایک طبقہ مسلمانوں میں ایسا پیدا ہو گیا جو تصوف کو متوازی دین قرار دینے لگا، اس کی مذمت کرنے لگا اور اس نے اسے حقارت اور نفرت سے دیکھنا شروع کیا۔

ii۔ اس غیر اسلامی تصوف کا ایک ردّ عمل یہ ہوا کہ مسلم معاشرے کے بہت سے لوگ

خصوصاً سلفی الفکر حضرات اور مغربی فکر و تہذیب سے متاثر مسلمان تصوف کو ردّ کرنے کے زور میں تزکیۂ نفس کی اہمیت ہی سے غافل ہو گئے اور تصوف کو بدعات و توہمات کا مجموعہ سمجھنے کی وجہ سے خود تزکیۂ نفس کی ان کے فکر و عمل میں کوئی اہمیت نہ رہی کیونکہ تصوف ہی کو تزکیۂ نفس کا نمائندہ اور علمبردار ادارہ سمجھا جاتا ہے۔

iii۔ علماء اور عوام کا ایک طبقہ اسی متاخر صوفیاء کے تصوف کو (جس میں بہت سی بدعات اور غیر اسلامی تصورات اور رسوم و رواج شامل ہو گئے ہیں) تزکیۂ نفس کا صحیح اور حتمی منہج سمجھنے لگا اور اسی کی پابندی پر اصرار کرنے لگا اور اس پر تنقید کے سارے نقطہ ہائے نظر کو غلط سمجھنے لگا۔

iv۔ بعض دعوتی اور اصلاحی جماعتیں ایسی اٹھیں جن کا تصور دین ناقص تھا (جیسے ہمارے ہاں دیوبندی احناف کی 'تبلیغی جماعت'، اور بریلوی احناف کی 'دعوت اسلامی') یہ فرد میں ایسی دینداری پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو فرد کی محدود مذہبی معنوں میں تربیت کرتی ہے جیسے نماز روزے کی پابندی، اسلامی لباس (جیسے داڑھی، ٹوپی، شلوار قمیص) کی پابندی اور تبلیغی و دعوتی سرگرمیوں کے لیے وقت نکالنا، پیسہ خرچ کرنا، سفر کرنا اور محنت کرنا وغیرہ لیکن انسان کی اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں (جیسے سیاست، معیشت، معاشرت، قانون، تعلیم ... وغیرہ) کو کماحقہ اہمیت نہیں دیتی۔

v۔ بعض جدید دینی تحریکیں (جیسے جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی، تحریک اسلامی وغیرہ) ایسی اٹھیں جو اقامت دین کے عنوان سے اجتماعی سیاسی جدوجہد پر اپنی زیادہ تر دینی کوششیں مرتکز رکھتی ہیں، یہ سمجھتی ہیں کہ غلبۂ دین کے لیے اجتماعی سیاسی جدوجہد کرتے ہوئے افراد جماعت کا خود بخود تزکیہ ہو جاتا ہے اور الگ سے فرد کے تزکیے کے لیے خصوصی کوششوں اور کثرت ذکر و فکر کی ضرورت نہیں۔

ہم نے مسلم معاشرے کے مختلف طبقات اور تصوف و تزکیۂ نفس و تصوف کے حوالے سے ان کے مختلف رجحانات کا ذکر اس لیے کرنا مناسب سمجھا تاکہ یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ عصر حاضر میں تصوف کی تجدید و تزکیۂ نفس کے لیے کسی نئے ادارے کی تشکیل کی ضرورت سمجھ میں آسکے اور اس مجوزہ تجدید اور تشکیل نو کی تجویز پیش کرتے وقت اس معاصر مائنڈ سیٹ کا لحاظ رکھا جاسکے۔

کیا عصر حاضر میں تزکیۂ نفس کے لیے کسی نئے ادارے کی ضرورت ہے؟

اس سوال کو یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ کیا عصر حاضر میں مسلمانوں کے تزکیۂ نفس کے لیے تصوف کا موجودہ ادارہ کافی ہے؟

جو لوگ موجودہ تصوف کے قائل ہیں یا اس میں کام کر رہے ہیں وہ تو یہی کہیں گے کہ تصوف کے موجودہ ادارے ہی کو استعمال کیا جائے کہ یہ صدیوں سے زیر استعمال ہے اور مفید ثابت ہو چکا ہے البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں اور اس میں جو غیر اسلامی رسوم و رواج پیدا ہو گئے ہیں ان سے بچنے کا اہتمام کر لیا جائے۔

دیکھا جائے تو یہ ایک وسیع تر موضوع ہے جس میں یہ امر زیر بحث آتا ہے کہ پرانی اصطلاحات کا استعمال جاری رکھا جائے یا ان کی جگہ نئی اصطلاحات استعمال کی جائیں.... ہماری رائے میں جہاں تک قرآن وسنت کی دینی اصطلاحات کا تعلق ہے جیسے صوم وصلوۃ وغیرہ وہ تو بہر حال جیسی ہیں ویسی ہی باقی رکھنی چاہئیں ورنہ فہم دین میں خلل پیدا ہو جائے گا۔ البتہ جہاں تک ان اصطلاحات کا تعلق ہے جو مسلم امہ نے یا مسلمان علماء نے ماضی میں اپنے مخصوص حالات میں وضع کیں تو وہ بہر حال اجتہادی عمل کا نتیجہ ہیں اور انہیں کوئی شرعی تقدس حاصل نہیں ہے۔ کسی اہل علم یا علماء کی نظر میں انہیں بعینہٖ رکھنا ضروری ہو تو انہیں برقرار رکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں اور اگر اہل علم انہیں بدل کر ان کی جگہ نئی اصطلاحات متعارف ومروج کرنا چاہیں تو اس میں بھی کوئی برائی نہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے سیاسی نظام کو ماضی میں خلافت کہا جاتا تھا[1] خلافت کے خاتمے کے بعد اب مسلمان ممالک نے جو سیاسی نظام اختیار کیا ہے اس کو خلافت کہا جائے یا نہیں؟ ہماری رائے میں یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں۔ جو لوگ اس اصطلاح کا استعمال مناسب نہیں سمجھتے مثلاً شرق اوسط میں الاخوان المسلمون اور برصغیر میں جماعت اسلامی بلکہ دوسری دینی سیاسی جماعتیں بھی جیسے جمعیت علماء اسلام، جمعیت علماء پاکستان، مرکزی جمعیت اہل حدث یا اہل تشیع کی تحریک اسلامی، کوئی بھی مسلمانوں کے سیاسی نظام کے لیے 'خلافت' کی اصطلاح استعمال نہیں کرتی بلکہ کوئی اسلام کے سیاسی نظام کو 'اسلامی جمہوریت' کہہ لیتا ہے تو کوئی 'نظام مصطفیٰ'۔ افغانیوں نے

---

[1] اگرچہ خلیفہ کا لفظ قرآن حکیم میں صاحب اقتدار و حاکم کے لیے آیا ہے (ص ۳۸:۲۶) لیکن مسلمانوں کے سیاسی نظام کو خلافت کہنا نہ قرآن میں آیا ہے اور نہ فرامین رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں۔

اسے 'امارت اسلامیہ' کہہ لیا۔ مطلب یہ کہ لوگ اس کے لیے خلافت کے متبادل الفاظ واصلاحات استعمال کر لیتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں ایسی تنظیمیں بھی ہیں جو اس کے لیے 'خلافت' کی اصطلاح استعمال کرتی ہیں اور خلافت کو اسلام کے سیاسی نظام کا نمائندہ ادارہ قرار دیتی ہیں اور اس اصطلاح کے استعمال پر اصرار کرتی ہیں جیسے عالم عرب میں حزب التحریر اور داعش اور ہمارے ہاں پاکستان میں تنظیم اسلامی اور تحریک عظمت اسلام وغیرہ۔

بہر حال ہم سمجھتے ہیں کہ تزکیۂ نفس کے ادارے (خواہ آپ اسے تصوف کہیں یا کچھ اور) کے منہج اور کام کی تجدید اور تشکیل نو کی ضرورت ہے۔ اس ادارے کی تجدید اور تشکیل نو کا جواز کیا ہے؟ اس پر بحث کرنے اور دلائل دینے کی بجائے ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ مجوزہ تجدید و تشکیل نو کی تفصیلات پیش کر دی جائیں جنہیں دیکھ کر قارئین کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ اس ادارے کی تجدید و تشکیل نو ضروری ہے۔

عصرِ حاضر میں تزکیۂ نفس کے ادارے کی تجدید و تشکیل نو

عصرِ حاضر میں تزکیۂ نفس کے ادارے کی تجدید و تشکیل نو کے بارے میں ہماری تجاویز درج ذیل ہیں: یاد رہے کہ ہم مجتہد فی التصوف ہونے کے دعوے دار نہیں، اس لیے یہ تجاویز بغیر کسی ادعا کے محض تزکیۂ نفس کا ایک پرانا طالب ہوئے، مختلف تجربات سے گزرنے اور مشاہدات کی بناء پر اور ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے اپنے مطالعۂ علوم ومعارف پر مبنی ایک حقیر فکری کاوش ہے اور اہل علم وصلاح سے درخواست ہے کہ وہ ان تجاویز کو بہتر بنانے کے لیے ان پر تبصرہ ونقد فرمائیں۔ فجزاهم الله عنا خير الجزاء.

ہماری رائے میں عصر حاضر میں تزکیۂ نفس کی کوششوں کو دو شعبوں میں بانٹ دینا چاہیے: ایک نسلِ نو کی تربیت اور دوسرے بڑوں (Grown ups) کا تزکیہ۔

نسلِ نو کی تربیت

۱۔ ہماری رائے میں یہ تقسیم ناگزیر ہے کیونکہ:

i۔ ماضی میں تعلیمی ادارے اتنے منظم اور موثر نہیں تھے جتنے آج ہیں۔ آج کل تو یہ حالت ہے کہ سکول جانے سے پہلے کے مرحلے کے لیے ڈیڑھ دو سال کے لیے پَری سکول (Pre-School)

سکول کھل گئے ہیں جن میں پلے گروپ، نرسری اور پریپ اوّل اور دوم کے نام سے کلاسیں ہوتی ہیں جن کے لیے بھاری بھر نصابی کتابیں ہوتی ہیں، بلکہ اس سے بھی پہلے نومولودوں کے پالنے کے لیے ''ڈے کیئر سنٹرز'' کے نام سے ادارے ہوتے ہیں۔ بعض سکول اقامتی ہوتے ہیں جن میں چھوٹے بچے دن رات رہتے ہیں۔ پھر بچوں کا بھاری بھر نصاب ہوتا ہے ورک بک ہوتی ہیں، ہوم ورک ہوتا ہے اور ہوم ورک کرانے کے لیے الگ اساتذہ کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ غریب اور متوسط طبقے کے لیے ٹیوشن سنٹرز اور اکیڈیمیاں ہوتی ہیں۔ ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ پھر بچے تین چار سال کی عمر سے سکول جانا شروع کرتے ہیں تو پی ایچ ڈی تک کے مراحل مکمل کرتے ہوئے وہ ۲۸ سے ۳۰ برس کے ہوجاتے ہیں گویا بچپن، لڑکپن اور جوانی سکول کالج اور یونیورسٹی کی نذر ہوجاتے ہیں۔

ii۔ ماضی میں میڈیا کا ادارہ اتنا منظم اور موثر نہیں تھا کہ وہ بچوں کے دل ودماغ کو اتنا متاثر کرتا جتنا کہ عصر حاضر میں ٹی وی، انٹرنیٹ اور موبائل وغیرہ کررہے ہیں۔

پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ عصر حاضر کی معاشرت میں ایک بچے/ طالب علم کی تربیت میں جتنا کردار تعلیمی دارے (سکول، کالج، یونیورسٹی) کا بڑھ گیا ہے، والدین کا اتنا ہی کم ہوگیا ہے۔ اب مائیں اپنے بچوں کو عموماً دودھ نہیں پلاتیں (کہ کہیں ان کی فِگر (Figure) خراب نہ ہوجائے) اور جب ذرا بڑا ہوجاتا ہے تو اُسے ٹی وی کے آگے بٹھا دیتی ہیں تاکہ وہ کارٹون ودیگر دلچسپ پروگراموں میں مصروف ہوجائے تاکہ وہ ماں کو'ڈسٹرب' نہ کرے اور جب تین چار سال کا ہوتا ہے تو فوراً اسے پری سکول میں بھیج دیا جاتا ہے۔ مسلم والدین کے اس رویے پر ایک الگ نوحے اور مضمون کی ضرورت ہے۔

خلاصہ یہ کہ عصر حاضر میں بچے کی تربیت میں تعلیمی ادارے کا کردار بہت بڑھ گیا ہے اتنا کہ بارہ چودہ صدیاں پیشتر اس کا تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ بچے کی تعلیمی زندگی کو تزکیے اور تربیت کا الگ مرحلہ قرار دیں اور اسے بڑی عمر کے لوگوں کے تزکیے سے الگ قرار دیں کیونکہ اس عمر کے تزکیے کے مسائل، مشکلات اور ان کا حل بڑی عمر کے لوگوں کے تزکیے سے الگ نوعیت کا ہوتا ہے۔

iii۔ طلبہ کی تربیت کو اہمیت نہ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلم فرد کو پہلے مغرب کی الحادی

فکر وتہذیب کے زیر اثر مغربی نظام تعلیم یا مغرب زدہ نظام تعلیم کے ذریعے بگڑنے دیا جائے بلکہ اس کے بگڑنے کا تماشا دیکھا جائے بلکہ اپنے ہاتھوں اسے خراب کیا جائے اور خراب ہونے دیا جائے اور جب وہ بڑا ہو جائے تو پھر کوئی صوفی صاحب آ جائیں کہ اب اس فرد کی اصلاح کرنی اور اسے اچھا عملی مسلمان بنانا ہے۔ یہ تصور مضحکہ خیز ہے۔ یاد رہے کہ اس وقت پاکستان میں طلبہ کی تعداد ساڑھے چار کروڑ ہے جو ملک کی کل آبادی کا پانچواں حصہ بنتی ہے اور یہی وہ عمر ہے جس میں انسان میں تبدیلی لانا آسان ہوتا ہے۔

iv۔ خلاصہ یہ کہ ہماری رائے میں نسل نو کی اسلامی تربیت تزکیۂ نفس کا ایک الگ اور مستقل موضوع ہے۔ اور یہ موضوع اتنا اہم اور منفرد ہے کہ اس پر غور وفکر میں لوگ زندگیاں گزار دیں، اس پر تصانیف کا انبار لگ جائے، اس پر پی ایچ ڈی کے کئی تھیسز کروائے جائیں، اس کے کئی مکاتب فکر وجود میں آئیں.... وغیرہ وغیرہ یعنی جس طرح کا کام آج تک تصوف پر ہوا ہے اسی طرح کا بلکہ اس سے بڑھ کر ٹھوس اور سنجیدہ کام بچوں کی اسلامی تربیت پر کرنے کی ضرورت ہے۔ اتنے بڑے موضوع پر اور اتنے وسیع کینوس پر چند سطور میں تفصیلی روشنی نہیں ڈالی جاسکتی البتہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے ہم رہنما خطوط بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مطلوبہ کام کے اہم سنگ ہائے میل اور اہم موضوعات کی نشاندہی کر دیں۔

۲۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر چکے ہیں کہ تزکیے کا گہرا تعلق نظام تعلیم سے ہوتا ہے اور اس کا معیار اللہ تعالیٰ نے خود عنایت فرما دیا ہے اور وہ ہے 'تعلیم کتاب وحکمت'۔ اور اس معیار پر اگر ہم اپنے موجودہ دینی مدارس کی تعلیم اور جدید معاصر تعلیم کو جانچیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ دونوں ناقص ہیں۔ مزعومہ دینی تعلیم، علوم حکمت کی تعلیم دینے سے گریزاں اور بے نیاز ہے اور یوں دین ودنیا کے علوم میں تفریق پیدا کر کے سیکولرزم کو فروغ دے رہی ہے اور فرد کو معاشرے اور ریاست سے کاٹ رہی ہے۔ اور جدید معاصر تعلیم، کتاب وسنت کی تعلیم سے بے نیاز ہے اور اس کا پورا تعلیمی ڈھانچہ غیر اسلامی مغربی فکر وتہذیب پر مبنی ہے لہٰذا تعلیم کی یہ ثنویت اور دوئی امت کے لیے زہر ناب ہے اور اس کا خاتمہ اصلاح کی ہر کوشش کا اولین ہدف ہونا چاہیے۔ بارہ سو سال تک امت مسلمہ کا نظام تعلیم وحدت پر مبنی رہا ہے اور موجودہ نظام تعلیم استعمار کے غلبے اور غلامی کے دور کا نتیجہ ہے لہٰذا اس ثنویت کو ختم کرنا اور نظام تعلیم کی وحدت قائم کرنا، ہماری رائے میں، اصلاح کی طرف پہلا قدم ہونا چاہیے۔

جب دونوں نظام تعلیم ناقص ہیں تو لامحالہ ان کا نظام تربیت بھی ناقص ہے اور ناقص شخصیت کی تعمیر کر رہا ہے۔ جب تک نظام تعلیم متوازن نہیں ہوتا وہ متوازن مسلم شخصیت کو جنم ہی نہیں دے سکتا۔

۳۔ جدید تعلیم کی اصلاح میں رکاوٹ یہ ہے کہ یہ مغربی فکر و تہذیب پر مبنی ہے اور مغربی قومیں آج بھی دنیا پر غالب و بالا دست ہیں اور ایک منصوبہ بندی کے ساتھ مسلم معاشرے پر اپنی تہذیب کے غلبے کے لیے کوشاں ہیں، پر امن طریقے سے بھی اور وحشیانہ قوت کے ذریعے بھی۔ انہوں نے مسلم حکمرانوں کو اپنا ایجنٹ بنا رکھا ہے اور مسلم معاشرے کے اکثر بالا دست اور مقتدر طبقات (فوج، عدلیہ اور بیوروکریسی وغیرہ) بھی ان کے ذہنی غلام ہیں اور ان کی فکری و تہذیبی بالا دستی کے معاون ہیں لہٰذا کوئی مسلم حکومت بھی، الا ماشاء اللہ، نظام تعلیم کی پوری طرح اصلاح کرنے پر قادر نہیں۔

اس کا حل یہ ہے کہ اسلام کی علمبردار اور غلبۂ اسلام کی خواہش مند قوتیں آگے آئیں اور پرائیویٹ سیکٹر میں نظام تعلیم کی اصلاح کریں اور اصلاح کی بنیاد پر ہر سطح کے تعلیمی ادارے (سکول، کالج اور یونیورسٹیاں) قائم کریں اور چلائیں اور ان کی چینز (Chains) قائم کریں۔

۴۔ دینی مدارس کی تعلیم کی اصلاح میں رکاوٹ یہ ہے کہ وہاں کوئی اصلاح کا طالب ہی نہیں اور کسی کو اصلاح کا احساس ہی نہیں۔ نہ علماء کرام میں اس کی خواہش ہے اور نہ مسلم حکومتوں کو اس سے دلچسپی ہے سوائے اس کے کہ مغربی حکومتیں ڈالر اور ڈنڈے کے زور سے ان سے کچھ کرائیں جس کی مدارس مزاحمت کرتے ہیں۔ علماء کو اس کا احساس ہی نہیں کہ ان کا نظام تعلیم بارہ سو سال تک وحدت تعلیم کے تصور پر قائم رہا ہے اور موجودہ مدرسے مغربی استعمار کے غلبے کے رد عمل میں صرف ڈیڑھ دو سو سال پہلے قائم ہوئے اور مسلم ممالک کی آزادی کے بعد ان کو اپنا لائحہ عمل تبدیل کر کے ان مدارس کو وحدت تعلیم کے تصور پر ڈھال لینا چاہیے تھا جیسا کہ ان کے اسلاف کا طریق کار تھا۔

۵۔ نظام تعلیم کی اصلاح کے ضمن میں یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ تعلیمی نظام کئی اجزاء کا مجموعہ ہوتا ہے جیسے ① انتظامیہ (ڈائریکٹر/ مالک ادارہ) ② سربراہ تعلیمی ادارہ (پرنسپل/ ریکٹر/ وائس چانسلر وغیرہ) ③ استاد ④ نصاب ⑤ طلبہ ⑥ تعلیمی ادارے کا ماحول (ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیاں)۔ جب تک ان سب اجزاء کی اسلامی تناظر میں اصلاح نہ ہو نظام تعلیم کی موثر

اصلاح ممکن نہیں۔ چونکہ یہاں تفصیل میں جانا مقصود نہیں (یہ تفصیلات ہماری کتابوں میں موجود ہیں)۔اس لیے ہم یہاں اختصار کے ساتھ جدید نظام تعلیم وتربیت اور دینی نظام تعلیم وتربیت کی اصلاح کی طرف چند جملوں میں اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے لیکن پہلے دونوں کے اصولی اور مشترکہ نکات کا ذکر ضروری ہے جو یہ ہیں:

۱۔ نظام تعلیم کے سارے مذکورہ اجزاء کی اصلاح،اسلامی تناظر میں

۲۔ شعبۂ تعلیم میں مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کی عدم پیروی بلکہ اس کارد

۳۔ ہر تعلیمی ادارے میں 'تربیت کمیٹی' کا قیام جو طلبہ کی اسلامی تربیت کے لیے لائحہ عمل مرتب کر کے اس کو نافذ کرے گی (اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے تربیت پر ہماری دو کتابیں)۔

۶۔ جدید نظام تعلیم وتربیت

۱۔ انتظامیہ عہد کرے کہ وہ مندرجہ بالا اصولوں پر اپنے تعلیمی ادارے کی اصلاح کرے گی اور تعلیم کے سارے اجزاء/شعبوں میں اسے نافذ کرے گی۔

۲۔ پرنسپل (خصوصاً اگر وہ مالک ادارہ نہ ہو تو) ان اصولوں کے مطابق تعلیمی اصلاح پر عمل درآمد کو یقینی بنائے گا۔

۳۔ ہر استاد کو یہ جاننا چاہیے کہ اس کا کام صرف سبق پڑھا دینا نہیں بلکہ ہر بچے کی تربیت اس کی ذاتی ذمہ داری ہے اور خود اچھا مسلمان بننا اور بچوں کو اچھا عملی مسلمان بنانا اس کا ہدف ہونا چاہیے۔استاد کا کام ہے کہ مذکورہ مطلوب اصلاح کے لیے وہ نصاب کی خامیوں کو پر کرے اور انتظامیہ و پرنسپل اگر اسلامی تعلیم وتربیت کے حوالے سے سستی اور عدم دلچسپی ظاہر کریں تو پھر بھی وہ حکمت سے اس کام کو کرتا رہے۔ یہ ذمہ داری ہر استاد کی ہے خصوصاً اسلامیات کے استاد اور تربیت کمیٹی کے ہیڈ کی۔ نیز اگر استاد تربیت یافتہ نہ ہو اور اس کے پاس تعلیم وتربیت کی کوئی ڈگری نہ ہو تو اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ سینئر اساتذہ سے سیکھے اور تربیت اساتدہ کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرے۔

۴۔ نصاب: ہر تعلیمی سطح پر اور ہر کلاس کے نصاب میں چار چیزوں کا لحاظ ضروری ہے: ایک قرآن وحدیث وعربی زبان کا لازمی نصاب۔ دوسرے عمرانی علوم کی اسلامی تناظر میں تشکیل

نو۔ تیسرے سائنسی مضامین کی اسلامی اسلوب میں تدوین اور چوتھے ہر سطح پر مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کی تفہیم وتنقید۔

۵۔ طلبہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ سکول کے نظم وضبط اور تربیت کمیٹی کے تجویز کردہ نظام اخلاق کی ہر قیمت پر پابندی کریں۔

۶۔ انتظامیہ، پرنسپل اور اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ مل کر تعلیمی ادارے کا ماحول اسلامی بنائیں اور ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں کو اسلامی تناظر میں مدون کریں (اس کی تفصیل ہماری تربیت کی کتابوں میں موجود ہے)۔

۷۔ دینی مدارس کا نظام تعلیم

۱۔ مہتمم صاحب کو اتنا بیدار مغز ہونا چاہیے کہ انہیں اپنے تعلیمی نظام میں اصلاح کا ادراک واحساس ہو۔ یہ طرز فکر غلط ہے کہ ہم چونکہ قرآن وحدیث پڑھاتے ہیں لہٰذا ہمارے نظام ونصاب میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے ہمارا لٹریچر)۔

۲۔ صدر مدرس صاحب کی ذمہ داری ہے کہ وہ نصابی تبدیلیوں کو نافذ کریں اور اساتذہ کی تربیت کا اہتمام کریں۔ اس کے لیے چھٹیوں میں ریفریشر کورسز رکھے جاسکتے ہیں۔

۳۔ نصاب: دینی مدارس کے موجودہ نصاب پر نظر ثانی کی سخت ضرورت ہے (دیکھیے ہماری کتاب ''ہمارا دینی نظام تعلیم'' اور ''نصاب مدنی'' والبرہان کے مضامین) جن کی تلخیص درج ذیل ہے:

i۔ **موجودہ نصاب میں اضافے:** قرآن حکیم کی متنوع عربی اور اُردو تفاسیر کا تعارفی مطالعہ، کتب احادیث کا تحقیقی مطالعہ، فقہ واصول فقہ کی کتب میں تقابلی مطالعہ کا اہتمام۔

ii۔ **اسلوب تدریس کی اصلاح:** ① قرآن وسنت کی تدریس میں اپنے مسلک کی تفصیلی تائید وترجیح اور دوسرے فقہی وکلامی مذاہب کی تغلیط وابطال کی روش کا ترک ضروری ہے۔ ② عربی زبان کو جدید انداز میں سکھایا جائے اور بولنے ولکھنے (انشاء) کی مہارت بھی پیدا کی جائے۔

iii۔ **جدید مضامین کا اضافہ:** ① سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وسوانح ② مطالعہ امت (مسلمان

کی تاریخ وجغرافیہ۔ ماضی وعصر حاضر) ③ فلسفہ یونان کے ساتھ مغربی فلسفہ کا مطالعہ ④ اسلامی فکروتہذیب ⑤ اسلام کا مطالعہ بطور نظام حیات جیسے اسلام کا معاشی نظام، سیاسی نظام وغیرہ۔ ⑥ معاصر علوم، انگریزی زبان کی تدریس۔ جدید عمرانی وسائنسی مضامین کا تعارفی مطالعہ۔ مغربی فکروتہذیب کا تفہیمی وتنقیدی مطالعہ۔ کمپیوٹر وانٹرنیٹ کا استعمال۔ تحقیق کے اسلامی ومعاصر طریقوں سے واقفیت۔

iv۔ اساتذہ: اساتذہ کو اپنی تربیت کا خود انتظام کرنا چاہیے اور تربیت اساتذہ پر لکھی گئی کتب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ نصاب کی خامیوں کو پر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بچوں کی تربیت کو ذاتی ذمہ داری سمجھنا چاہیے اور دینی نظام تعلیم کی خامیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان کی تربیت کرنی چاہیے مثلاً فرقہ واریت اور مسلک پرستی سے بچنا، مسجدوں پر قبضہ نہ کرنا اور چندے پر زندگی گزارنا وغیرہ۔

v۔ ہم نصابی وغیرہ نصابی سرگرمیوں میں لائبریری کا استعمال اور کھیلوں کا اہتمام ضروری ہے۔ بزم ادب کا قیام تاکہ طلبہ کی تقریری وتحریری صلاحیتوں کو جلا ملے۔

بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کے اہم نکات کی وضاحت کے بعد اب ہم بڑوں کی تربیت کی طرف آتے ہیں۔

بڑوں (Grown ups) کی تربیت کا منہج

ا۔ بڑوں کو خود سے یا کسی کی ترغیب وترہیب سے اپنی تربیت کی فکر لاحق ہو جائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اپنی اصلاح کے لیے مسلسل دعاء کا اہتمام کرنا چاہیے۔

۲۔ دعاء کے ساتھ دوا کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ جو یہ ہے کہ قرآن وسنت کا مطالعہ کرے خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور صحابہ کرام کی سوانح کا مطالعہ اس کے لیے مفید ہوگا۔

یہ بات صحیح ہے کہ آدمی کے نفس کے تزکیے اور اصلاح کے لیے قرآن وسنت کی تعلیمات کافی وشافی ہیں جس کے لیے ان سے موثر استفادہ ضروری ہے۔ خصوصاً کتب احادیث میں کتاب الرقاق اور کتاب الزہد کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ انسان کا دل پگھلے اور وہ آخرت کی تیاری کی فکر میں لگ جائے۔

۳۔ تاہم بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غلط تعلیم وتربیت سے نفس انسانی بگڑ جاتا ہے، غیر صحت مند عادتیں پختہ ہوجاتی ہیں اور آدمی بظاہر خواہش رکھتا اور کچھ کوشش بھی کرتا ہے، قرآن وحدیث کا مطالعہ بھی کرتا ہے لیکن اپنی اصلاح عملاً کر نہیں پاتا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

یہ ایسی حالت ہوتی ہے جیسے آدمی کا معدہ خراب ہوجائے تو اسے لاکھ مکھن اور گھی کھلاؤ اور طاقتور غذائیں دو لیکن وہ صحت مند نہیں ہوگا۔ یہاں آدمی کو ضرورت پڑتی ہے کہ خارجی مدد لے (جیسا کہ آدمی جسمانی طور پر بیمار ہوجائے تو طبیب/ ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے) اور جیسا کہ قرآن وحدیث نے صحبت صالح کا حکم دیا ہے، آدمی کسی ایسے نیک آدمی کی صحبت اختیار کرے اور اس کی مدد لے جو اس کے نفس کا معالجہ کرے اور اسے اس قابل بنادے کہ وہ قرآن وسنت کی تعلیمات پر عمل کرسکے اور آخرت کے خسارے اور نقصان سے بچ جائے۔

ایسے نیک، سمجھدار اور ماہر نفس کو مرشد (راہ ہدایت دکھانے والا، مزّکی (تزکیہ کرنے والا) یا مربی (صحیح تربیت کرنے والا) کہتے ہیں ماضی کے تجربات کے پیش نظر اور تزکیۂ نفس کے ادارے (تصوف) میں جو غیر اسلامی رسوم ورواج داخل ہوگئی ہیں، ان کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ آج کے زمانے میں مرشد/ مزکی/ مربی میں مندرجہ ذیل خصوصیات ہونی چاہئیں۔

۱۔ وہ قرآن وسنت کا عالم ہو۔

۲۔ وہ قرآن وسنت کا عامل ہو یعنی ان کی تعلیمات واحکام پر عمل کرتا ہو۔

۳۔ وہ لوگوں کے ذہنی ونفسی حالات کا گہرا ادرک کھتا ہو یعنی نفس کے بگاڑ کا علاج کرسکتا ہو۔ نہ صرف مسلم روایت میں علاج نفس کا ماہر ہو بلکہ جدید فلسفہ ونفسیات اور مغربی فکر وتہذیب سے بھی بخوبی واقف ہو اور عصر حاضر اور جدید ذہن کی بناوٹ اور اس کے اشکالات سے بھی آگاہی رکھتا ہو۔

۴۔ اس سے ملنے والے اور اس سے مستفیض ہونے والے اکثر لوگ دین دار ہوں اور اسے دیکھ کر اور اس کی مجلس میں بیٹھ کر خدا یاد آجائے اور آخرت کی فکر لاحق ہوجائے۔

۵۔ وہ ان خرابیوں سے پاک ہو جو تصوف میں داخل ہوگئی ہیں جیسے:

- لوگوں سے پیسے لینا
- لوگوں سے تعظیم وادب کی خواہش رکھنا
- لوگوں کو غیر اسلامی باتوں کی تعلیم دینا....وغیرہ۔

ہم مزید وضاحت کے لیے عرض کرتے ہیں کہ:

- مرشد کی حد سے زیادہ تعظیم کرنا غلط ہے جیسے ناسمجھ لوگ زندہ پیر صاحب کو (یا فوت شدہ بزرگ کی قبر پر) سجدے کرتے ہیں۔ان کے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں اور ان کی طرف پشت نہیں کرتے بلکہ الٹے پاؤں واپس آتے ہیں۔(اس کی اصل صرف اتنی ہے کہ سالک [راہ حق پر چلنے والے] کے دل میں اپنے مرشد ومربی کے لیے محبت واحترام کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں کیونکہ وہ دین پر چلنے اور آگ سے بچنے میں اس کی مدد کرتا ہے۔اور اپنی حدود میں یہ محبت مفید ہے کہ سالک مرشد کی بات کو اہمیت دیتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔)
- مربی کو پیسے نہیں دینے چاہئیں
- مربی کے پاس حقیر دنیاوی خواہشات کے لیے نہیں جانا چاہیے جیسے مرضی کی لڑکی سے شادی ہوجائے، انعامی بانڈ نکل آئے وغیرہ۔

تاہم کسی نیک اور بزرگ آدمی سے اپنی جائز خواہشات کے لیے دعا کی درخواست کی جاسکتی ہے۔دراصل کسی نیک یا بزرگ آدمی کو مرشد ماننے کا بنیادی ہدف صرف یہ ہونا چاہیے کہ وہ آپ کو اللہ کی معصیت سے بچنے میں مدد دے یا درجۂ احسان حاصل کرنے اور باعمل مسلمان بننے میں مدد دے۔اس کے پاس حقیر دنیاوی مفادات کے لیے جانا غلط ہے۔

- مرشد کے انتخاب کی وجہ اس کی اہلیت ہونی چاہیے اور اس کا میرٹ یہ ہے کہ وہ دین کا عالم اور عامل ہو اور نفس انسانی کے علاج میں مہارت رکھتا ہو۔ جو لوگ داڑھی مونڈتے اور لباس وفیشن میں کفار کی مشابہت اختیار کرتے ہیں، دینی احکام پر عمل نہیں کرتے اور نہ دینی احکام کا علم رکھتے ہیں ان کو محض گدی نشینی اور سجادہ نشینی کی بناء پر اور اس بناء پر کہ وہ کسی نیک آدمی کی نسل میں سے ہیں، مرشد نہیں بنانا چاہیے۔

یہ لوگ جنہوں نے سجادہ نشینی کو پیسے بنانے کا ذریعہ اور کاروبار بنا رکھا ہے یا اس کے ذریعے سادہ لوح لوگوں کے ووٹ لیتے اور صوبائی یا مرکزی اسمبلی کے رکن بن کر یا وزارت بن کر حبّ جاہ ومال کے مریضوں کی سی زندگی گزارتے ہیں جیسا کہ جنوبی پنجاب اور سندھ کے اکثر پیر ہیں۔ظاہر

ہے یہ سب دین کے نام پر فراڈ ہے اور اس کا تزکیۂ نفس سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ پیر صاحب کو پتہ ہوتا ہے کہ تزکیۂ نفس کیا ہے اور کیسے ہوتا ہے اور نہ مریدوں کو اس بات کا شعور ہوتا ہے کہ وہ پیر صاحب کے پاس کس غرض سے گئے ہیں۔ بس کسی نیک آدمی کا نام بیچا جارہا ہوتا ہے کہ وہ صاحب فلاں بزرگ کی اولاد ہیں۔ بھئی کسی نیک آدمی کی اولاد ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے اگر خود ان صاحب کے اپنے اعمال اچھے نہ ہوں۔

۶۔ تزکیۂ نفس کے ادارے کی تشکیل نو کے سلسلے میں ہم مزید عرض کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا امور کو پیش نظر رکھنے کے بعد لوگوں کی اصلاح کے لیے ایک مرکز یا تربیت گاہ بنانے میں بھی کوئی ہرج نہیں بشرطیکہ مربی اس کا ذوق صلاحیت اور اس کے وسائل رکھتا ہو۔ اگر معاشرہ یعنی عام لوگ یا کھاتے پیتے لوگ اس طرح کی تربیت گاہ قائم کرنے اور چلانے کے لیے اپنی خوشی اور رضا سے اور اسے ایک دینی کام سمجھتے ہوئے اس کے لیے فنڈز مہیا کردیں تو اس طرح کی تربیت گاہ قائم کی جاسکتی ہے۔

اس تربیت گاہ کا نظام العمل ایسا ہونا چاہیے جو اس کام کے قیام کے اصل مقصد یعنی تزکیۂ نفس کو پورا کرنے والا ہو یعنی یہاں قرآن وحدیث کی تعلیم ہوتی ہو، ذکر کی کثرت ہو۔ تربیت پر گفتگو ہوتی ہو، آخرت کی فکر پیدا کی جاتی ہو، دین پر عمل کا شوق پیدا کیا جاتا ہو، دل کو نرم کرنے والی اور پگھلانے والی گفتگوئیں ہوتی ہوں اور لوگ یہاں رہ کر دین پر عمل کرنا سیکھیں تاکہ اس تربیت گاہ سے واپس جائیں تو شریعت کے مطابق ساری زندگی گزاریں۔

ان اصولوں کو سامنے رکھ کر اس اقامتی تربیت گاہ کا ٹائم ٹیبل اور اس کے تفصیلی قواعد وضوابط بنائے جاسکتے ہیں۔ اور اس امر کی کوشش کرنے میں کوئی ہرج نہیں کہ اس طرح کی تربیت گاہیں سارے ملک میں قائم کی جائیں بشرطیکہ اس کے لیے صحیح مربی موجود ہوں اور وہ صحیح لائحہ عمل کے مطابق لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کریں۔

عصر حاضر میں تزکیۂ نفس کے مفہوم، اہمیت، ضرورت اور طریق کار کہ عصر حاضر میں تزکیۂ نفس کیسے ہوسکتا ہے یا کیسے ہونا چاہیے؟ ان سوالوں کے جوابات کے حوالے سے جو وضاحت ہم نے کی ہے اللہ کرے وہ کچھ لوگوں کے اطمینان کا سبب بن جائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین.

اسلام اور پاکستان　　'نقیب سحر'

انصاف کس چڑیا کا نام ہے؟

یہ ہمارا ظالمانہ نظامِ عدل!

[پچھلے سال ایک ''حق گو'' صاحب نے البرہان میں لکھنا شروع کیا۔ غالباً ہمارے بار بار کے ٹوکنے پر وہ بدمزہ ہوئے اور خاموش ہو گئے۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمیں علماء کرام کی قہر انگیز نظروں سے بھی بچنا ہے اور حکمرانوں کے ڈنڈے سے بھی سر بچانا ہے کہ ہمارا سر پہلے ہی اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں سوچتے سوچتے پلپلا ہو رہا ہے۔ اب جناب 'نقیب سحر' نے اس وادیٔ پرخار میں قدم رکھا ہے۔ اللہ کرے وہ اپنے لیے اور ہمارے لیے کسی وبال کا سبب نہ بنیں کہ حق گوئی کو برداشت کرنا ہمارے عہد میں خاصا مشکل ہے۔ مدیر]

۱۔ پانچ سال پہلے ایک اداکارہ عتیقہ اوڈھو مبینہ طور پر دو بوتلوں کے ساتھ ہمارے نظامِ عدل کے سامنے پیش کی گئی کہ ان بوتلوں میں شراب خانہ خراب تھی۔ پانچ سال گزرنے کے باوجود نہ جرم طے ہو سکا اور نہ ہی بریت عمل میں آئی۔ جون 2017 کی کسی تاریخ کو کیس ملتوی کرتے ہوئے کوئی نئی تاریخ ڈالی گئی ہے۔ ہے نہ فوری انصاف کی شاندار مثال؟

۲۔ پچھلے دنوں خبر آئی کہ قتل کے ایک ملزم کو سپریم کورٹ نے اس کی پھانسی لگنے کے دو سال بعد بری کر دیا۔ اب اس بے گناہ قرار دیئے جانے والے ملزم کو پھانسی پر جھولنے کے جرم کا ذمہ دار کسے قرار دیا جائے؟ جج صاحبان کو، نظام عدل کو یا ہم جیسے گستاخانِ عدالت کو جو اس بے انصافی اور ظلم کا ذکر کر رہے ہیں؟

۳۔ قتل کے ملزموں (مجرموں) کی اپیلیں 14,14 سال زیر التوا رہتی ہیں اور متعلقہ ملزم یا مجرم پھانسی کی سزا پانے والوں کی کوٹھڑی میں بند رہتے ہیں۔ گویا بغیر فیصلے کے وہ عمر قید کی سزا تو پہلے ہی بھگت چکے ہوتے ہیں۔ اب اگر بری بھی ہو جائیں تو اُن کی بھگتی ہوئی یہ عمر قید کس کھاتے میں شمار ہو گی۔ ہے کوئی منصف اس پر غور کرنے والا؟

۴۔ چوری ہوتی ہے، ڈکیتی ہوتی ہے، قتل ہوتا ہے یا اسی طرح کوئی اور جُرم ہوتا ہے۔ پولیس

درجنوں لوگوں کو زیرِ تفتیش لاتی ہے اور پھر بھتہ لے کر ایک ایک کر کے چھوڑتی جاتی ہے۔ لتر وڑ، اور بے عزتی اس کے علاوہ ان غریبوں کے حصے میں آتی ہے جو جرم بے گناہی میں پکڑے جاتے ہیں۔ عدل وانصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ججز، عوام کے ٹیکسوں سے لاکھوں روپے تنخواہ لینے والے اسمبلیوں میں براجمان عوامی نمائندگی کے دعویدار اور عوامی خزانے پر پلنے والے بیوروکریٹ حتیٰ کہ منبر ومحراب کے مالک متقی دینی قائدین میں سے کسی نے اس کھلی بے انصافی اور ظلم پر کبھی کوئی ایک لفظ بھی کہا ہے؟

۵۔ کرکٹ ٹیم چیمپئن ٹرافی جیت کر آتی ہے تو وزیر اعظم صاحب ہر کھلاڑی کو ایک، ایک کروڑ روپے انعام کا اعلان کرتے ہیں۔ میٹرو بسوں اور میٹرو ٹرینوں پر اربوں روپے خرچ کیے جا رہے ہیں۔ نئے نئے پراجیکٹس کے افتتاحوں پر ٹھپہ جمانے کے لیے کروڑوں روپے چند گھنٹوں میں اڑا دیئے جاتے ہیں۔ اخبارات اور ٹی وی چینلز کو اپنی جھوٹی پبلسٹی کے لیے اربوں کے فنڈز لٹائے جا رہے ہیں لیکن چند سو بوڑھے پنشنرز کو قانون کے مطابق ڈبل پنشن کے چند لاکھ روپے کے بقایا جات ادا کرنے کے لیے خزانے میں فنڈز دستیاب نہیں ہیں۔ لاہور ہائی کورٹ جس کے گھٹنے شاید جواب دے چکے ہیں بوڑھے پنشنرز کی بات سن تو لیتی ہے لیکن حق داروں کو حق نہیں دلا سکتی۔ میں جب کبھی اخباروں میں اپنے محترم جج صاحبان کے ریمارکس کی شکل میں بڑھکیں پڑھتا ہوں تو مجھے ایک خوش فہمی سی ہونے لگتی ہے کہ ہمارے نظام عدل میں بڑی طاقت ہے لیکن بوڑھے پنشنروں کے معاملہ میں معلوم ہوتا ہے کہ محکمہ خزانہ پنجاب کا چیف کلرک یا حکومت پنجاب کا چیف کلرک بہت طاقتور ہے کہ ہمارے مضبوط نظام عدل کی بات ایک کان سے سنتا ہے اور دوسرے سے نکال دیتا ہے۔

۶۔ ایک خاتون ایم این اے (سابق) جو اب ایک ضلع کونسل کی چیئر پرسن ہے، کی بی۔اے کی ڈگری اصلی یا جعلی ہونے کا سوال اُٹھا۔ یہ قصہ 2002، کے الیکشن سے شروع ہوا اور آخر کار 2013 کے الیکشن کے ایک سال بعد طے ہو گیا کہ موصوفہ کی بی۔اے کی ڈگری جعلی ہے۔ ایم این اے شپ سے فراغت ہوئی اور ضمنی الیکشن میں اپنے بیٹے کو کامیاب قرار دلا کر ڈگری کے معاملے میں اپیل میں چلی گئی۔ اب اپیل دائر کیے تین سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے۔ اپیل کورٹ ابھی تک طے نہیں کر پائی کہ اس کی ذیلی عدالت کا فیصلہ درست تھا یا غلط جب کہ یونیورسٹی سے ڈگری کی تصدیق کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ درکار ہوتا ہے۔ ذیلی عدالت نے ڈگری

کے اصلی یا جعلی ہونے کا فیصلہ گیارہ سال سے زیادہ عرصہ میں کیا کہ ڈگری جعلی ہے اور اب اپیل کورٹ نے تین سال سے زیادہ عرصہ لگا دیا ہے کہ آیا ذیلی عدالت کا فیصلہ درست ہے یا نادرست۔ ہے نہ فوری انصاف کی روشن مثال۔

۷۔ اسلام آباد کے ایک علاقہ سرائے خربوزہ میں ایک شادی شدہ خاتون نے جو اپنی فیملی کے ساتھ کرایہ کے مکان میں رہ رہی تھی، کرائے سے بچنے کے لیے اپنا تین مرلے کا پلاٹ اور زیور بیچ کی ایک پانچ مرلے کا چھوٹا مکان خریدا۔ مکان اپنے خاوند کے نام لگوایا۔ مکان رہائش کے قابل نہیں تھا اور فیملی کے پاس ابھی وسائل نہیں تھے کہ مکان کو رہائش کے قابل بنا لیتے۔ اسی اثنا میں مذکورہ خاتون کا خاوند ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گیا۔ مبینہ طور پر کچھ لوگوں نے ایک پولیس ملازم کی اشیر باد سے مکان پر قبضہ کر لیا اور ساتھ ہی مبینہ طور پر مکان خریدنے کے جعلی کاغذات بھی تیار کر لیے۔ مکان تو ابھی متوفی کے نام تھا۔ مبینہ قبضہ کرنے والا شخص اسلام آباد کی سول کورٹ میں چلا گیا کہ مذکورہ مکان اُس نے خریدا ہے اور کچھ لوگ اُسے دھمکیاں دے رہے ہیں اور پیسے مانگ رہے ہیں۔ فاضل عدالت نے حکم امتناعی جاری کر دیا۔ اب وہ مبنیہ قابض شخص مزے سے مکان میں رہ رہا ہے اور بے چاری بیوہ عورت اپنے دو یتیم بچوں سمیت دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ خواتین کے تحفظ اور حقوق کی دعویدار موجودہ حکومت اپنے تمام قوانین اور دعوؤں کے ساتھ حکمِ امتناعی کے سامنے عاجز ہے۔ کیا مذکورہ بیوہ عورت اور اس کے یتیم بچوں کو فوری انصاف ملے گا؟ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے جس کا جواب ہمارے نظام عدل کے پاس شاید نہیں ہے۔

۸۔ عزت مآب آصف علی زرداری پر کرپشن کے متعدد کیسسز بنے۔ گرفتار ہوئے، سات سال سے زیادہ جیل میں شاہانہ زندگی بسر کی۔ مجید نظامی مرحوم جیسے حق پرست سے مردِ حر کا خطاب پایا۔ 90 سے زیادہ دفعہ کسی نہ کسی بہانے اپنے کرپشن کیسز کا التوا کرایا گویا سرے سے نظام عدل بروئے کار ہی نہیں آیا۔ پھر جنرل مشرف سے ڈیل کر کے ضمانت کرائی اور دساور کو سدھار گئے۔ واپس تب آئے جب بے نظیر کو ایک دہشت گردانہ کاروائی میں مار دیا گیا۔ وصیت نامے کا ڈرامہ رچایا اور مردِ حر ملک کے صدر بن گئے۔ مسٹر ون پرسنٹ اور مسٹر ٹین پرسنٹ کا خطاب پانے والے ’’شہیدوں‘‘ کے خودساختہ وارث صدارتی استثنا کا مزہ اُڑاتے رہے۔ وہ کرپشن کے کیسز اور وہ سوئیٹرزلینڈ کے بنکوں میں کروڑوں ڈالر، سرے محل اور فرانس کا محل اور دنیا جہان میں مبینہ طور پر پھیلی جائدادیں بھی قائم ہیں اور ہمارا نظام عدل بھی اپنے پھریرے لہرا رہا ہے۔ ہے نہ مزے کی بات!

۹۔ ایان علی لاکھوں ڈالروں کے ساتھ غیر ملکی سفر کے دوران پکڑی جاتی ہے۔ گرفتاری ہوتی ہے اور عدالت میں ہر دفعہ پیشی کے وقت شوبز کا ساسماں ہوتا ہے۔ آخر میں بے چارے عام لوگوں کو اس پرُ لذت شوبز سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ موصوفہ کی ضمانت بھی ہو جاتی ہے۔ ای سی ایل سے نام بھی نکل جاتا ہے۔ یہ سب کچھ انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہوتا ہے اور ہمارے شاندار نظام عدل کے ڈسے غریب، بے نوا اور بے بس لوگ خون کے آنسو پی کر رہ جاتے ہیں۔

۱۰۔ عدالتیں پکارتی رہ جاتی ہیں۔ ملزموں کو اشتہاری بھی قرار دے دیتی ہیں لیکن جنرل پرویز مشرف، عمران خان اور طاہر القادری جیسے لوگ جلسوں میں، ریلیوں میں، ٹی وی چینلز پر اور اپنی پریس کانفرنسوں میں جلوہ افروز ہونے کے باوجود، ہمارے نظام عدل کی دسترس سے باہر رہتے ہیں۔ ہے نہ " قومی راہنماؤں " کے عزت واحترام کی شاندار مثال۔

۱۱۔ سنتے آئے تھے کہ معصوم عن الخطا اللہ کے نبی ہوتے ہیں اور محروم عن الخطا اللہ کے ولی، لیکن ہمارے نظام عدل میں سب خطاؤں سے پاک وہ ہستیاں ہیں جن کے سابقے حرف ''ج'' سے شروع ہوتے ہیں یعنی جج، جنرل اور جرنلسٹ۔ ان پاک باز ہستیوں کے دم خم سے ہی ہمارے نظام عدل کا بھرم قائم ہے ورنہ پل بھر میں نظامعدل کے رکھوالوں کو گھاس چرنے پر مجبور کر دینا ان کا بائیں ہاتھ کا نہیں بلکہ بائیں پاؤں کا کھیل ہے۔

خبریں تو اور بھی ہیں لیکن فی الحال صرف اتنا ہی۔

وطن عزیز کے مذکورہ بالا شاندار نظام عدل کے متعلق ایک واقف عدل سے بات ہوئی تو فرمانے لگے کہ یہ اس شاندار نظام عدل کی ہی برکت ہے کہ لاکھوں وکیلوں کی روٹی روزی لگی ہوئی ہے اور سول جج سے لے کر سپریم کورٹ کے عزب مآب جسٹس صاحبان تک کو باعزت روزگار مہیا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ فوری اور سستے انصاف کی فراہمی سے قانون کے ان رکھوالوں کے گھروں کے چولھے ٹھنڈے ہو جائیں اور ائیر کنڈیشنروں سے مزین ان کے مسکن صحرائے تھر کی طرح تپنے لگیں؟ یقین نہ آئے تو کچھ کچہریوں کے چکر لگا لو۔ کالے کوٹوں کے ساتھ چمکتے دمکتے سیکڑوں چہروں کے ساتھ ہزاروں سائلین کے بھُس بھرے چہرے ساری حقیقت تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیں گے۔

اسلام اور پاکستان مدیر

ہم رجعت پسند سہی.... لیکن

گندے اور نجس پانی کا استعمال

گندہ اور نجس پانی پینا اور اس سے وضو اور غسل کرنا صحت کا اور سماجی و تہذیبی ہی نہیں شرعی مسئلہ بھی ہے

روزنامہ نوائے وقت لاہور کی ۱۶ جولائی ۲۰۱۷ء کی خبر کے مطابق سپریم کورٹ کے حکم سے قائم شدہ واٹر بورڈ کمشن کی ٹاسک فورس نے جو رپورٹ پیش کی ہے اس کے مطابق کراچی سے پانی کے جو نمونے لیے گئے ہیں ان میں سے ۳۳ فیصد میں صاف پانی میں سیوریج/گٹر یعنی انسانی فضلے کا پانی شامل ہے۔ رپورٹ کے مطابق سندھ کے دوسرے شہروں میں صافی پانی میں انسانی فضلے والے پانی کے شامل ہونے کی شرح یہ ہے: میر پور خاص ۲۸ فیصد، ٹنڈو الہ یار ۲۳ فیصد، بدین ۳۳ فیصد، جامشورو ۳۶ فیصد، ٹنڈو محمد خان ۳۰ فیصد، حیدر آباد ۴۲ فیصد اور لاڑکانہ ۶۰ فیصد۔ ایک اندازے کے مطابق اگر سپریم کورٹ ملک کے دوسرے حصوں کا بھی سروے کرائے تو ہوشربا انکشافات سامنے آسکتے ہیں۔

اگر ہم نے کہا کہ پرانا طریقہ جس میں انسانی فضلہ دھوپ، ہوا اور گرمی سے خشک ہو کر کھیتوں کی مٹی میں شامل ہو کر اس کی زرخیزی کو بڑھانے کا سبب بنتا تھا اور گھر بھی صاف ستھرے رہتے تھے کہ فضلہ اٹھا کر باہر پھینک دیا جاتا تھا اور اب نئی مغربی تہذیب اس گند کو کھیتوں سے اٹھا کر گھر کے اندر لے آئی ہے اور اسے پانی میں شامل کر دیا جاتا ہے اور پھر وہی پانی ہم انسان پیتے ہیں تو ہم نے اگر اس کی مذمت کی اور یہ کہا کہ اس میں کون سی عقل مندی کی بات ہے تو ممکن ہے ہمیں پینڈو اور رجعت پسند کہا جائے لیکن ہم ان ’’ماڈرن‘‘ مسلمانوں سے پوچھتے ہیں کہ اللہ و رسول نے تمہیں حلال اور طیب چیزوں کے کھانے پینے کا حکم دیا تھا لیکن تمہاری یہ نئی تہذیب ہمیں انسانی فضلہ ملا پانی پینے اور استعمال کرنے پر مجبور کر رہی ہے تو اس کے بارے میں آپ کی صفائی پسند طبیعت کیا کہتی ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ یہ ایک سنجیدہ ایشو ہے جس پر حکومت اور عوام کو غور کرنا چاہیے کہ کروڑوں لوگوں کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں۔ اور یہ سماجی اور تہذیبی مسئلہ ہونے کے ساتھ ساتھ شرعی مسئلہ بھی ہے اور ہم علماء کرام سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ مسلمان عوام کو بتائیں کہ کیا انسانی فضلہ ملا پانی پینا جائز ہے؟ اور کیا ایسے پانی سے وضو کرنا اور شرعی غسل کرنا جائز ہے؟

استفسارات　ڈاکٹر محمد امین

استفسارات

کون سے علماء انبیاء کے وارث ہیں؟ فرقہ واریت کا سدباب کیسے ہوسکتا ہے؟ دین فروشی سے کیا مراد ہے؟

سوال: علماء انبیاء کے وارث ہیں، اس سے کون لوگ مراد ہیں؟ یہاں مذہبی علم رکھنے والوں کو انبیاء کا وارث کہا گیا ہے یا عصری علوم کے ماہرین بھی انبیاء کے وارث ہو سکتے ہیں؟

جواب: ۱۔ قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں علم دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ علم جو انسان کی ہدایت کے لیے ناگزیر ہے اور دوسرا وہ علم جو انسان کو دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق گزارنے میں مدد دیتا ہے۔[۱] قرآن پہلی طرح کے علم کو ''علم الکتاب'' اور دوسری طرح کے علم کو 'علم الحکمۃ' قرار دیتا ہے۔ پہلی قسم کا علم جو انسانی ہدایت کے لیے ناگزیر ہے وہ بنیادی عقائد (جیسے توحید، رسالت اور آخرت)، عبادات اور اخلاق کا علم ہے اور اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی اور حلال وحرام کا علم ہے۔ مسلم مفکرین اسے 'فرض عین' قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ اسے 'علمِ نقلی' (یا جمع کی صورت میں علوم نقلیہ) بھی کہتے ہیں یعنی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا گیا ہے اور اس کی تشکیل میں انسانی عقل کا کوئی کردار نہیں۔ یہی وہ علم ہدایت ہے جس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے۔[۲]

۲۔ دوسری قسم کا علم، ''علم الحکمۃ'' (یا جمع کی صورت میں'' ''علوم حِکمیہ'') کہلاتا ہے۔ انہیں پہلی قسم کے 'علوم نقلیہ' کے مقابلے میں ''علوم عقلیہ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کے تین بڑے دائرے ہیں۔ ایک علوم نقلیہ کا فہم اور ان کا عملی زندگی میں انطباق۔ دوسرے عمرانی علوم۔ چونکہ عمرانی علوم (جیسے معاشیات، سیاسیات وغیرہ) انسانی فکر وعمل کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لہٰذا یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے ان کے بنیادی اصول قرآن (وسنت) میں بتا دیے ہیں اور تفصیلات کا تعین امت کے علماء ومجتہدین پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اس میں عصری ضروریات اور تقاضوں کے مطابق رنگ بھر لیں اور تفصیلات وضع کرلیں گویا عمرانی علوم کا ایک

---

[۱] البقرہ ۲:۱۲۹

[۲] سنن ابن ماجہ: ۲۲۴

حصہ مبنی بر وحی ہے اور دوسرا حصہ مبنی بر انسانی عقل و تجربہ۔ علوم حکمیہ کا تیسرا دائرہ خالص عقلی علوم کا ہے جیسے سائنس و ٹیکنالوجی اور زراعت و صنعت وغیرہ سے متعلق علوم و فنون۔ چونکہ انسان اپنی عقل و تجربہ کی وجہ سے ان علوم عقلیہ میں خود کفیل ہے اس لیے شریعت ان میں مداخلت نہیں کرتی جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک زرعی معاملے (تابیر نخل یعنی کھجوروں میں پیوند لگانے کے بارے) میں انصاری صحابہ سے فرمایا کہ تم ان معاملات کو خود بہتر سمجھتے ہو اور ان میں مجھ سے مراجعت ضروری نہیں۔ (۱)

۳۔ ان علوم حکمیہ عقلی علوم کو مسلم مفکرین 'فرض کفایہ' قرار دیتے ہیں۔ (۲) یعنی ان کا اتنا حصول واجب ہے جس سے معاشرے کی ضرورت پوری ہو جائے۔ جیسے معاشرے میں اتنے ڈاکٹر/طبیب ہونے ضروری ہیں جو عوام کے علاج معالجے کے لیے ضروری ہوں۔ اگر اسلامی معاشرہ/حکومت/ریاست اتنے ڈاکٹر/طبیب تیار نہیں کرتے جن سے عوام کی طبی ضروریات پوری کر سکیں تو پورا معاشرہ/حکومت/ریاست گویا ایک فرض ادا کرنے میں غفلت کے مرتکب اور گناہ گار سمجھے جائیں گے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ انبیاء کو بنیادی طور پر لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث فرماتا ہے اور چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی تھے لہٰذا آپ نے ان علماء کو اپنا وارث قرار دیا جو یہ علم ہدایت لوگوں تک پہنچائیں۔ تاہم ضمناً اس میں عمرانی علوم کے ماہرین کو بھی شامل سمجھا جا سکتا ہے جن کے بنیادی اصول شریعت خود فراہم کرتی ہے اور سائنسی علوم کے ماہرین کو بھی جو لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

۵۔ دراصل مذہبی علم اور غیر مذہبی یا سیکولر علم کی تفریق غیر اسلامی ہے کیونکہ اسلام میں علم ایک وحدت ہے اور علوم حکمیہ (یا عقلیہ) کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق ہوں یا ان کے خلاف نہ ہوں اور مقاصد شریعت کو پورا کرنے والے ہوں۔ اگر وہ ایسا کریں تو یہ دنیاوی علوم بھی عین اسلامی اور دینی ہیں لہٰذا عمرانی اور سائنسی علوم کو غیر دینی یا غیر اسلامی کہنا غلط ہے۔ اور اسی طرح علوم دینیہ کو قرآن و سنت اور فقہ و عربی زبان تک محدود سمجھنا بھی غیر اسلامی اور غلط رویہ ہے انیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی استعمار کی غلامی اور مداخلت سے پہلے مسلم

(۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۳۶۲

(۲) امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد اوّل کا پہلا باب 'کتاب العلم'

روایت میں علم ایک وحدت سمجھا جاتا تھا اور اس میں دینی اور دنیاوی کی تفریق موجود نہ تھی کہ شریعت تو نام ہی اس علم کا ہے جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ہم دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق کیسے گزاریں۔ لہٰذا علم کی دینی و دنیاوی میں تقسیم صحیح نہیں ہے۔

سوال: مساجد و مدارس کو کس طرح فرقہ واریت سے پاک کیا جا سکتا ہے؟

جواب: ہمارے معاشرے میں مساجد و مدارس کے فرقہ واریت کو فروغ دینے کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک ہماری حکومتوں کی خواہش و کوشش اور دوسرے علماء کی کم نظری۔

ا۔ پہلے نکتے کی تفصیل یہ ہے کہ انگریز نے برصغیر میں اپنے قدم جمانے کے لیے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑایا بلکہ مسلمانوں کے اندر بھی گروہ بندی پیدا کی اور اسے مستحکم کیا تا کہ مسلمان آپس میں مذہبی بنیادوں پر بھی لڑتے رہیں اور ان کی طاقت تقسیم ہو جائے۔ اہل حدیث علماء کو بدنام کرنے کے لیے انگریز نے باقاعدہ مہم چلائی اور احناف میں دیوبند اور بریلی کی تقسیم اور ان میں کلامی اور فقہی مسائل کا تنازعہ کھڑا کرنے اور غیر سیاسی تبلیغی جماعت کے قیام کو بھی بعض دانشور اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد انگریز نے کوشش کی کہ اس کے حمایت یافتہ جاگیردار، سیاستدان اور بیوروکریٹ ہی برسراقتدار آئیں تا کہ ملک میں شریعت نافذ نہ ہو اور مغربی فکر و تہذیب اور اس کے اصول و اقدار ہی ملک میں سکہ رائج الوقت بن جائیں۔

اس کے لیے اہل مغرب نے یہ بھی کوشش کی کہ دینی عناصر متحد ہو کر ایک قوت نہ بنیں چنانچہ اس نے حنفی دیوبندی، حنفی بریلوی، اہل حدیث، جماعت اسلامی اور اہل تشیع سب سے الگ الگ سیاسی جماعتیں بنوائیں اور انتخابات میں ان کو آپس میں لڑایا تا کہ ان کی ہو ٔخیزی ہو ٔلوگ ان سے مایوس ہوں اور انہیں ووٹ نہ دیں بلکہ مغربی استعمار کے اشارے پر پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں نے ہر مسلک کے اندر کئی کئی گروپ اور دھڑے بنوائے تا کہ دینی قوتوں کی طاقت تقسیم در تقسیم ہو کر کم اور بے اثر ہو جائے۔ اپنی اس اسکیم میں استعماری قوتیں اور پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کامیاب رہی اور دینی قوتیں سیاسی لحاظ سے ناکام ہو گئیں۔

پاکستان میں فرقہ واریت کو فروغ دینے کے لیے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے جو دیگر سوچے سمجھے اقدامات کیے ہیں ان میں سے اہم یہ ہیں:

i۔ حکومت نے ہر مسلک کی دینی تعلیم کا امتحانی بورڈ (وفاق) الگ الگ منظور کیا جن میں

سے ہر ایک کا اپنے اپنے مسلک کے مطابق نصاب ہے۔ اگر حکومت چاہتی تو ان سب کا ایک بورڈ بنوا سکتی تھی۔

ii۔ پاکستان میں کوئی مسجد یا مدرسہ قائم نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ اپنی درخواست/ پروفارما میں اپنا مسلک ڈیکلیئر نہ کرے یعنی جب تک کوئی مدرسہ یا مسجد اپنا مسلک ظاہر نہ کرے اسے مسجد یا مدرسہ بنانے کی اجازت نہیں ملتی گویا حکومت خود مسلک پرستی کو فروغ دیتی ہے۔

iii۔ حکومت اپنے سارے دینی اداروں میں مثلاً رویت ہلال کمیٹی، اسلامی نظریاتی کونسل وفاقی شرعی عدالت، وزارت مذہبی امور کی سیرت کانفرنسوں اور اوقاف کے صوبائی محکموں میں خطیبوں اور اماموں کی تعیناتی میں.... ہر جگہ مسالک کو پیش نظر رکھ کر تقرریاں اور تعیناتیاں کرتی ہے۔

iv۔ دینی سیاسی جماعتوں کو مسلک کی بنیاد پر رجسٹریشن دی جاتی ہے اور انتخاب لڑنے کی آزادی دی جاتی ہے حالانکہ یہ خلاف آئین ہے۔ حکومتیں حسب ضرورت اور حسب سہولت ان دینی سیاسی جماعتوں میں سے کسی سے اتحاد کرتیں اور انہیں وزارتیں دیتی ہیں۔

v۔ حکومت کا مدارس کی ڈگریوں کو تسلیم نہ کرنا: حکومت اس وقت دینی مدارس کی ثانویہ عامہ اور ثانویہ خاصہ (گویا آٹھ میں سے پہلے چار سال) کی ڈگریوں کو میٹرک اور ایف اے کے برابر تسلیم نہیں کرتی اور عالیہ کو بی اے اور عالمیہ کو ایم اے علوم اسلامیہ وعربیہ کے مساوی تسلیم کرتی ہے تو بھی پوری طرح نہیں بلکہ صرف تعلیم وتدریس کے لیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی مدارس سے فارغ ہونے والے اکثر طلبہ سوائے مساجد ومدارس کے کہیں اور ملازمت نہیں کر سکتے اور انہیں مجبوراً روزگار کی خاطر اپنے اپنے مسلک کی بنیاد پر نئی مسجدیں اور نئے مدرسے قائم کرنے پڑتے ہیں۔ یہ چیز مسلک پرستی کو فروغ دینے، دوسرے مسالک کی مساجد پر قبضہ کرنے اور حکومتی اراضی پر زبردستی مساجد ومدارس قائم کرنے پر اکساتی اور مجبور کرتی ہے۔

ان اقدامات سے واضح ہے کہ ہماری حکومتیں نہ صرف یہ کہ مسلک پرستی اور فرقہ واریت کو ختم نہیں کرنا چاہتیں بلکہ وہ اسے فروغ دینے کی حکمت عملی پر کام کر رہی ہیں۔

۲۔ مغربی استعمار اور مغرب زدہ پاکستانی حکمرانوں کی مذہبی فرقہ واریت کو ختم نہ ہونے دینے کی کوشش اپنی جگہ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فرقہ واریت اور مسلک پرستی کو ختم کرنے کی

بنیادی ذمہ داری ہمارے علماء کرام کی ہے۔ اگر وہ اخلاص اور فراست کے حامل ہوتے تو اغیار اور اپنی حکومتوں کی چالوں کو وہ ناکام بنا سکتے تھے۔

اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مسلک پرستی نتیجہ ہے اپنے ائمہ کی اندھی تقلید کا اور ان کے اجتہادات کو حتمی اور مقدس سمجھنے کا اور نئے اجتہاد اور حریت فکر کا راستہ ترک کرنے کا۔ اور بدقسمتی سے اس تقلیدی رویے نے ابتدائی چند صدیوں کے بعد راہ بنانا شروع کردی تھی اور مسلم زوال کا یہ ایک بڑا سبب تھی جس نے مسلم معاشرے میں تخلیقی تفکر کی راہیں بند کیں اور افکار تازہ کے راستے مسدود ہونا شروع ہوئے۔ مغربی استعمار نے اسلام اور مسلم دشمنی میں اس گرتی دیوار کو دھکا دے کر زمین بوس کردیا اور مسلم اجتماعی اداروں کو گرا کر اپنی فکر وتہذیب کے مطابق نئے اجتماعی ادارے قائم کیے خصوصاً انہوں نے مسلمانوں کے نظام تعلیم وتربیت کو نشانہ بنایا۔ اس اثناء میں اُس نے مسلمانوں میں مذہبی فرقہ واریت کو فروغ دیا اور مسلمانوں کو کمزور کیا کہ یہی ان کے استعماری مفاد میں تھا۔

دینی مدارس چلانے والے علماء اگر فراست سے کام لیتے تو قیام پاکستان کے بعد انہیں فرنگی عہد کے ردعمل میں قائم کردہ اپنے تعلیمی نظام کو جاری رکھنے کی ضرورت نہ تھی لیکن وہ اپنی پرانی روش پر قائم رہے۔ انہوں نے اپنے نصاب، طریق تدریس، طریق امتحان میں کوئی تبدیلی نہ کی اور مسلک پرستی فروغ پاتی رہی۔

۳۔ یہ فرقہ واریت کس طرح ختم یا کم کی جاسکتی ہے؟ اگر حکومت پاکستان اخلاص سے چاہے تو یہ بڑی حد تک کم ہوسکتی ہے اور اس کے لیے اسے کم از کم وہ سارے اقدامات کرنا ہوں گے جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یعنی (۱) مسالک کی بنیاد پر دینی جماعتوں کی عدم رجسٹریشن (۲) مدارس ومساجد کی رجسٹریشن میں مسلک کا عدم لحاظ (۳) موجودہ وفاقوں (دینی تعلیم کے امتحانی بورڈز) کو تحلیل کرکے ایک وفاق کا قیام (۴) وفاقی شرعی عدالت، اسلامی نظریاتی کونسل محکمہ اوقاف اور دوسرے اداروں میں تقرریوں کے وقت مسالک کا عدم لحاظ (۵) مدارس کی ڈگریوں کو تسلیم کرنا وغیرہ۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ فرقہ واریت کم کرنے کے حوالے سے علماء کرام خود اپنی اصلاح کریں یا ان کی تنظیمیں اس اصلاحی کام میں ہاتھ ڈالیں تو عملاً اس کے امکانات، بوجوہ کم ہیں اگرچہ ایسے معتدل مزاج علماء کرام ہر مکتبۂ فکر میں موجود ہیں جو مسلک پرستی کو کم کرنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح ملی یکجہتی کونسل اور ملی مجلس شرعی جیسی اتحاد کی علمبردار اور فرقہ واریت کو کم کرنے کی داعی تنظیمیں بھی موجود ہیں لیکن یہ تنظیمیں بھی اتنی فعال، موثر اور باوسائل نہیں ہیں کہ مسلک پرستی کم کرنے کے لیے علماء کی تعلیم وتربیت کا کوئی بڑا پروگرام چلاسکیں۔ اس لیے ہماری تجویز یہ ہے کہ حکومت کو چاہیے کہ معتدل مزاج علماء کرام کے تعاون سے مدارس کے مہتمم حضرات اور اساتذہ کی تربیت کا الگ الگ اور مستقل جاری رہنے والا پروگرام بنائے جس میں ان کو مسلک پرستی اور فرقہ واریت کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے اور انہیں اس پر مائل اور اس کا قائل کیا جائے کہ وہ اپنے مدارس ومساجد کو سارے مسالک کے لیے اوپن کردیں یعنی ہر مسجد میں ہر مسلک کے آدمی کو نماز پڑھنے کی کھلی اجازت ہو اور مسجدوں کے ناموں سے مسلک حذف کردیا جائے اور مسجد کمیٹی میں مختلف مسالک کے لوگوں کو نمائندگی دی جائے۔ اسی طرح دینی مدارس میں ہر مسلک کے طالب علم کو داخلے کی اجازت ہو اور اساتذہ میں بھی مختلف مسالک کے لوگ موجود ہوں جس طرح کہ جدید تعلیم کے اداروں میں ہوتا ہے اور اس سے کوئی خرابی جنم نہیں لیتی۔

مدارس کا موجودہ طریق تدریس بھی اصلاح طلب ہے۔ علماء کرام جانتے ہیں کہ قرآن وحدیث کی تعلیم کے وقت بھی ہر مسلک کے مخصوص فقہی وکلامی مسائل کو ثابت کرنے اور فریق مخالف کے موقف کی تغلیط وابطال پر تفصیلی تقریریں کی جاتی ہیں جو کئی کئی دن چلتی ہیں اور دین کے کئی بنیادی اور اہم مسائل سے سرسری گزرا جاتا ہے۔ اس منہج کو ترک کردیا جائے تو مسلک پرستی کے رجحان میں کافی کمی آسکتی ہے۔

اسی طرح مدارس میں طلبہ کو تقریر کی مشق کرائی جاتی ہے تاکہ وہ خطبات جمعہ میں اور اس کے علاوہ بھی تقریر کرنا سیکھ جائیں۔ اس طرح کی مشقوں میں جو موضوعات طلبہ کو تجویز کیے جائیں ان میں کوئی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو مسلک پرستی اور فرقہ واریت کو فروغ دیتا ہو بلکہ اخوت، برداشت اور رواداری کے فروغ اور اتحاد امت، اتحاد بین المسالک والعلماء کے موضوعات پر طلبہ سے تقریریں کرائی جانی چاہئیں تاکہ اس رجحان کو وہ مستقبل کی عملی زندگی میں اپنا سکیں۔

۴۔ ہم ان لوگوں کی حمایت نہیں کرتے جو فرقہ واریت کم کرنے کا یہ نسخہ بتاتے ہیں کہ حکومت مسجدوں کو قومیالے یعنی نیشنلائیز کرلے۔ علماء کا تقرر سرکاری طور پر کیا جائے، ان کی تنخواہ کے باقاعدہ گریڈ ہوں۔ حکومت ہر جمعے کا خطبہ سرکاری طور پر جاری کرے اور سارے علماء وہی خطبہ دینے کے پابند ہوں وغیرہ وغیرہ۔

ہماری اس رائے کا سبب ہمارا یہ مشاہدہ ہے کہ ماضی میں ہماری حکومتوں کی طرف سے جتنے بھی اسلامی اداروں کے قیام وانصرام کے تجربے ہوئے وہ سب ناکام ہوئے۔ جامعہ عباسیہ بہاولپور کو سرکاری سطح پر ایک بڑی اسلامی یونیورسٹی بنانے کا پروگرام بنایا گیا، فنڈز بھی مختص کیے گئے لیکن آج وہ دوسری (سیکولر) یونیورسٹیوں کی طرح کی ایک عام یونیورسٹی ہے مثلاً اس میں اور پنجاب یونیورسٹی میں کوئی خاص فرق نہیں سوائے اس کے کہ بہاولپور یونیورسٹی کے نام میں اسلامیہ کا لفظ موجود ہے۔ پنجاب میں ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ محکمہ اوقاف کے تحت بیسیوں دینی مدارس موجود ہیں لیکن ان کی اکثریت کا غذی ہے اور وہ عملاً فعال نہیں ہیں۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد جب بنی تو دودھ تھی اب وہ لسی بن چکی ہے اور یہ لسّی دن بدن پتلی ہوتی جارہی ہے اور (خاکم بدہن) وہ دن بہت دور نہیں لگتا جب اس میں اور قائداعظم یونیورسٹی میں کوئی خاص فرق نہیں رہے گا۔

اگر دینی مدارس کو قومیا لیا گیا تو چند سال کے اندر اندر یہ غیر فعال ہوجائیں گے۔ ہماری یہ سوچی سمجھی اور حتمی رائے ہے اور ہمیں اس پر سو فیصد یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا اور یہ مسلم معاشرے کا بہت بڑا نقصان ہوگا۔ اگر امام صاحب سرکاری ملازم ہوں گے تو وہ بتدریج اسی ذہن کے حامل ہوجائیں گے جس کے ہمارے دوسرے سرکاری ملازم ہیں۔ پھر مقتدیوں میں سے کسی ایک کو نماز خود ہی پڑھانی پڑے گی اور بتدریج مسجدیں غیر فعال ہوتی چلی جائیں گی۔ اس لیے ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ جو لوگ فرقہ واریت کم کرنے کے لیے مسجدوں اور مدرسوں کو قومیانے کے حامی ہیں وہ اگر بدنیت اور بدخواہ نہیں بھی ہیں تو ناسمجھ اور حقائق سے ناواقف ضرور ہیں کیوں کہ مسجدوں اور مدرسوں کو قومیانے کا آخری نتیجہ یہی نکلے گا کہ یہ غیر فعال ہوجائیں گے۔

اس کے کئی اسباب ہیں جن میں سے ایک اہم یہ ہے کہ ہماری انتظامیہ یعنی بیوروکریسی کا مزاج غیر اسلامی اور سیکولر ہے۔ اس کی تعلیم وتربیت کی بنیاد مغرب پرستی، دین سے دوری اور اسلامی اقدار سے بُعد بلکہ لادینیت، دین بیزاری اور دینی اداروں کو حقارت ونفرت سے دیکھنے کی ہے۔ لہٰذا جو ادارہ بھی ان کے قبضے میں جائے گا وہ اسے اپنے مزاج کے مطابق ڈھال کر رہیں گے۔ ممکن ہے مسجد کی بجلی کاٹ دی جائے اور کئی ہفتوں تک بحال نہ ہو کہ اس کے لیے سرکاری فنڈز جاری نہیں ہوسکے اور بل نہیں ادا ہوسکے۔ پھر سرکاری نوکری کا جو مزاج ہے اس میں کام چوری اور ہڈ حرامی زوروں پر ہے لہٰذا امام مسجد اگر سرکاری ملازم ہوگا تو وہ بتدریج دوسرے سرکاری

ملازموں جیسا ہی ہو جائے گا اور ہم اپنے تجربے اور مشاہدے کی بات پہلے کر ہی چکے ہیں لہٰذا ہم مساجد اور مدارس کو فرقہ واریت سے بچانے کے لیے ان کو قومیانے کے قائل نہیں ہیں بلکہ ہماری رائے میں مساجد و مدارس کو پرائیویٹ سیکٹر ہی میں رہنا چاہیے اور ان کی اصلاح کے وہی طریقے اختیار کیے جانے چاہئیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

سوال: دین فروشی کسے کہتے ہیں؟ قرآن وحدیث میں دین فروشی سے متعلق جو وعید آئی ہے وہ کس طرح دین بیچیں گے؟

جواب: دین فروشی یہ ہے کہ دینوی مفادات پر دین کو قربان کر دیا جائے یا حقیر دینوی مفادات کے لیے دین قبول نہ کیا جائے یا دین پر عمل نہ کیا جائے یا دین کی غلط تشریح کی جائے۔

تفصیل میں جانے سے پہلے یہ بات نوٹ کی جائے کہ دین کی قیمت پر بڑے سے بڑا دنیاوی مفاد حقیر ہی ہوتا ہے خواہ اس میں کروڑوں اربوں روپوں کا فائدہ ہی کیوں نہ ہو! کیونکہ انسان کی سب سے قیمتی متاع اس کا دین اور ایمان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصول فقہ کے اکثر ماہرین مقاصد شریعت میں دین کو پہلے نمبر پر رکھتے ہیں اور جان، مال، عزت، عقل کی حفاظت کو بعد میں لاتے ہیں کیونکہ اگر دین خطرے میں ہو تو آدمی جان دینے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے (اور شہید ہو کر وہ دائمی زندگی پاتا ہے) اور اپنا مال بھی آدمی خوشی سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ گویا آدمی کو اپنا دین اور ایمان اس کی جان اور اس کے مال سے بھی بڑھ کر عزیز ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن دین فروشی کی قیمت کو ''ثمنا قلیلاً''، یعنی تھوڑی قیمت کہتا ہے خواہ وہ فائدہ عملاً بہت بھاری بھر یا کروڑوں اربوں ہی کا کیوں نہ ہو کہ دین کے مقابلے میں وہ بہرحال کم تر ہی ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے کہا کہ دین فروشی کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ آدمی دنیوی مفادات کے لیے دین قبول ہی نہ کرے اور اسے رد کر دے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخاطبین کفار قریش تھے کہ اسلام قبول کرنے میں وہ اپنے آباواجداد کے دین کی مخالفت سمجھتے تھے اور ان کو اپنی سرداریاں اور اقتدار خطرے میں نظر آتا تھا۔ اس لیے اپنے ان مفادات کے لیے وہ دین اسلام قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ یہود کے اسلام قبول نہ کرنے کی وجہ بھی یہی تھی۔

دین فروشی کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ دین کا کوئی عالم کسی دنیوی مفاد کے لیے مثلاً کسی حاکم سردار، افسر یا آجر کی خوشنودی کے لیے یا اس کی ناراضی سے بچنے کے لیے یا اپنا روزگار اور عہدہ

بچانے کے لیے یا حصول جاہ و مال کے لیے دین کا صحیح موقف چھپائے اور نہ بتائے یا جان بوجھ کر اس کی غلط تشریح کر دے یا دینی اصول و اقدار کی ہزیمت اور ترک قبول کر لے۔

دین فروشی کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ کوئی سیاستدان یا جرنیل غیر ملکی کافر قوتوں سے مرعوب ہو کر یا ڈر کر اپنے ملک میں شریعت نافذ نہ کرے اور اسلامی احکام پر عمل کرے اور نہ کروائے تا کہ اس کا اقتدار سلامت رہے اور طول پکڑے۔

یہ بھی دین فروشی ہی ہے کہ کوئی سیاستدان یا جرنیل بالادست مغربی قوتوں کو یہ یقین دلائے کہ اگر وہ برسراقتدار آ گیا تو ملک میں شریعت نافذ نہیں کرے گا بلکہ کفار کے مفادات کی حفاظت کرے گا۔

ماضی میں دین اور ملت فروشی کی مثال میر صادق و میر جعفر تھے جنہوں نے ذاتی جاہ مال کے لیے مسلم فوجوں کو انگریزوں سے شکست دلائی۔ اور اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ ہمارے ایک سابق فوجی حکمران (جنرل پرویز مشرف) نے کافر مغربی طاقتور قوموں سے ڈر کر اپنے ہمسائے برادر اسلامی ملک کو تباہ کرنے میں ان کی مدد کی اور کفار کی مزاحمت کرنے والے مجاہدین کو پکڑ پکڑ کر کافروں کے حوالے کیا اور اس کے باقاعدہ پیسے وصول کیے اور اپنی کتاب میں اس کا فخر سے ذکر کیا۔ یہ دین فروشی اور ملت فروشی کی ایک مکروہ زندہ مثال ہے۔

دین فروشی کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ کوئی نام نہاد دانشور اسلامی اصول و اقدار کو چھوڑ کر دنیا کی غالب اور بالادست الحادی مغربی تہذیب کے اصول و اقدار مثلاً سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم کو صحیح سمجھے اور قبول کر لے، ان کی تعریف کرے، انہیں بہتر اور قابل عمل سمجھے اور اسلامی اصول و اقدار کو پرانا، ناکارہ اور ناقابل عمل (Obsolete) سمجھے اور قرار دے۔

اسی طرح ہمارے نزدیک یہ بھی دین فروشی ہی کی ایک قسم ہے کہ کوئی اسلامی سکالر یا عالم جاہ و مال کے لیے یا شہرت اور ناموری کے لیے یا غیر اسلامی اصول و افکار سے متاثر و مرعوب ہو کر اور انہیں اسلامی اصول و اقدار سے بہتر سمجھتے ہوئے دین اسلام کی ایسی تشریح کرے جو اس بالادست الحادی مغرب تہذیب کے مطابق اور اس کافر تہذیب کے علمبردار ممالک کے مفادات کے مطابق ہو۔ اس کی مثال ماضی میں غلام احمد قادیانی اور غلام احمد پرویز کی اور ہمارے عہد میں جاوید غامدی اور عمار ناصر وغیرہ کی ہے۔